Ailaan Jari Hai
اعلان
جاری
ہے.....
افسانے
غلام نبی شاہد

غلام نبی شاہد

نام کتاب : اعلان جاری ہے

مصنف : غلام نبی شاہدؔ

نوعیت : افسانے

کمپوزنگ : فیروز احمد کمار (تھری ڈی ڈیزائننگ)

سرورق : فردوس احمد

سنہ اشاعت : ۲۰۱۳ء

(پہلا ایڈیشن)

دوسرا ایڈیشن : ۲۰۱۵ء

تعداد : ۳۰۰

قیمت : ۴۰۰

کتاب ملنے کا پتہ

۱۔سکندر نیوز ایجنسی، لال چوک ۲۔تھری ڈی ڈیزائننگ آبی گذر لال چوک

۳۔غلام نبی شاہدؔ: وقفہ۔ نیو ایئر پورٹ روڈ، پرے پور باغات، سرینگر

جموں و کشمیر فکشن رائٹرس گلڈ۔ آبی گذر، سرینگر

E-mail: shahidshabaan53@gmail.com

Cell No. :- 09797946911

انتساب

دلیپ کمار نہرو کے نام

جس نے خواب میں

مجھ سے

پوچھا

"میں قتل کیوں ہوا......؟"

نانہ، ٹوٹھ

فہمیدہ

عالی جی

اور

فیض عالم

کی نذر

کٹتی ہے پکنے سے پہلے لہلہاتی بھی نہیں
میرے کھیتوں میں اُگی یہ فصلِ سر ہے مختلف

رفیقؔ راز

فہرست

تبصرے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سپاس نامہ

میں پہلے ہی ''عرضِ حال'' میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ چند کہانیاں لکھ کر میں نے کوئی بڑا ادبی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ اس لئے کہ مجھے اپنی تنگ دامنی کا پوری طرح احساس ہے اور میں اس بات پر اب بھی قائم ہوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی میں بہت خوش قسمت رہا کہ ''اعلان جاری ہے'' اشاعت کے بعد ان چند کہانیوں کی عوامی اور ادبی حلقوں میں کافی سراہنا ہوئی۔ خاص کر افسانہ ''آجادی'' کا ذکر ادبی اور عوامی سطح پر کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوا۔ اس سلسلے میں جناب غلام نبی خیال نے ایک قدم آگے بڑھ کر مجھے توصیفی سند عطا کر کے میرے حوصلوں کو اور جلا بخشی......

ہمارے یہاں افسانوی ادب کے حوالے سے کسی افسانوی مجموعے کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ تاہم اس سلسلے میں میرا تجربہ ''اعلان جاری ہے'' کی پہلی اشاعت کے بعد کچھ مختلف رہا۔ میں نے تجارتی اور سرکاری اداروں کے بجائے اسے ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ عام پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کی جس کے دوران مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہاں ادب پڑھنے

والوں کا ایک بہت ہی بڑا اور وسیع طبقہ موجود ہے جسے کشمیر میں لکھے جانے والے ادب سے بہت لگاؤ اور محبت ہے۔ شرط صرف یہ کہ آپ اُسے اپنے ادب میں کسی حد تک شامل کر کے اُس کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ میں شاید ''اعلان جاری ہے'' میں اس شرط کو کچھ حد تک پورا کرنے میں کامیاب رہا اور اس کے نتیجے میں اس بڑے طبقے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے دور کے چند معتبر ادیبوں، دانشوروں، صحافیوں، کالم نگاروں کی طرف سے بھی بہت پذیرائی نصیب ہوئی۔ جس نے بالآخر ''اعلان جاری ہے'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا حوصلہ دیا۔ اس دوسرے ایڈیشن میں بھی پہلے ایڈیشن کی طرح میں نے چند قد آور ادبی شخصیات کے چند تبصرے اور تاثرات شامل کئے۔ یہ تبصرے اور تاثرات موصول کرنے کے بعد مجھے اچھی طرح یہ احساس ہوا کہ ہمارے درمیان ایسے مخلص لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب ہمارے قلم سے ایک معمولی چنگاری جنم لے تا کہ یہ مخلص لوگ اُسے شعلہ بنا دے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہمارے قلم سے نکلی چنگاری میں اتنا دم ہو کہ وہ شعلہ بن سکے۔!!

☆......غلام نبی شاہد

۵ فروری ۲۰۱۵ء

............☆☆☆............

حرفِ آغاز

کسی مفکر نے کہا ہے کہ اپنے آس پاس اپنے اردگرد ہم بہت سارے لوگوں کو دیکھتے ہیں ان میں سے کچھ لوگوں کو ہم برسوں سے جانتے ہیں ان کے ساتھ رہتے بھی آئے ہیں لیکن اس قربت اور نزدیکی کے باوجود ہم اُن کو سمجھ نہیں پاتے وجہ یہ نہیں ہے کہ اُن کی شخصیت یا اُن کی زندگی میں کوئی پیچیدگی ہے کوئی اُلجھاو ہے جس کی وجہ سے اُن کی ذات تک پہنچنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے بلکہ بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ وہ بظاہر عام سے لگتے ہیں لیکن حقیقت میں عام آدمی نہیں ہوتے اُن میں سادگی اور بھولا پن ہے جو اُنہیں قبول کرنے سے مانع رکھتا ہے!

خواجہ احمد عباس نے کہا تھا کہ اظہار کی بے باکی کسی قلم کار کے یہاں صرف اس وقت دیکھنے میں آتی ہے جب وہ زندگی کی عدالت میں سچ اور سچ کے سوا کچھ نہ بولنے کا عہد کرلیتا ہے!!

جب ہم ان دونوں باتوں کو جوڑتے ہیں تو غلام نبی شاہد کی شخصیت اُن کی زندگی کے مختلف پہلو اور اُن کے تحریر کردہ افسانے نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ اُن کی شخصیت میں سادگی اور بھولا پن ہے اور ان کے افسانوں میں سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان کی کہانیوں کی خاموشیوں سے جو آواز سنائی دیتی ہے وہ دلوں کو چھوتی ہے ذہن کو جھنجھوڑتی ہے اور بار بار اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ کچھ ہو گیا ہے کچھ ہو رہا ہے اور کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہوا ہے کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے یہ سب کچھ ''اعلان جاری ہے'' میں پوشیدہ ہے!!!

''اعلان جاری ہے'' غلام نبی شاہد کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۲۲ کہانیوں پر

مشتمل ہے......!

شاہد صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۷۳ء میں کیا۔ جب اُن کی پہلی کہانی ''کتنے جھنڈے'' کے نام روزنامہ آفتاب میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں ''مٹی کے دیئے'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں اردو اور کشمیری میں ۱۴ افسانے شامل تھے۔ چھ کشمیری زبان میں اور آٹھ اردو میں۔ اِن کہانیوں کے تخلیق کار تھے مشتاق احمد مشتاق (مشتاق مہدی) سید یعقوب دلکش اور غلام نبی شاہد۔ مٹی کے دیئے اپنی نوعیت کی ایک دلچسپ کوشش تھی۔ اس مجموعے میں شاہد صاحب کے چار افسانے شامل ہیں۔

''اعلان جاری ہے'' کی کہانیاں شاہد صاحب کی تیس سالہ تجربات کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس مجموعے کی قریب قریب ساری کہانیاں کشمیر کے پُر آشوب، پُر درد اور کرب آمیز دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ذہنی کشمکش اور احساسِ محرومی کی آگ میں جلتے ہوئے افسانوں کی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں جو جیتی جاگتی اَن گنت خوبصورت اور بدصورت تصویریں نظر آتی ہیں وہ ساری تصویریں ہماری جانی پہچانی ہیں ان تصویروں میں ہمیں جو چہرے نظر آتے ہیں ہم انہیں بخوبی جانتے ہیں، انہیں بخوبی پہچانتے ہیں ان کہانیوں کے سارے کردار ہم میں سے ہیں'' دراصل ان کہانیوں میں کشمیر کا پسِ منظر ہے، کشمیر کے حالات و واقعات کی منظر کشی ہے۔ ان کہانیوں میں دور و کرب کی ایک عجیب فضا نظر آتی ہے۔ ان کہانیوں میں کشمیر کی مٹی کی خوشبو ابھرتی ہے......اور سب سے بڑی بات یہ کہ غلام نبی شاہد نے اپنی ذہنی پختگی کے سہارے ان کہانیوں کی زلفیں سنواری ہیں......!

نور شاہ

سرینگر

۷؍جون ۲۰۱۳ء

پیشِ کلام

ادب زندگی کا چربہ ہے یا آئینہ، اس بحث پر ہزاروں برسوں میں ہزاروں صفحے سیاہ کئے گئے ہیں لیکن ادب اِس سارے ہنگامے کو ان سنی کر کے اپنے روپ سروپ، قدوقامت اور ہجا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے اپنا منصبی کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ مختلف زمانوں کے حالات حوالہ جات کے لئے ہم آرکیالوجی، علمِ تواریخ اور کچھ عرصے سے صدابندی اور عکس بندی کے ذرائع برت رہے ہیں۔ قدیم یونانیوں کی جسی اور بصری عادات ومعمولات کے لئے ہمیں اُسی طرح ہومر کا سہارا لینا پڑتا ہے جس طرح ۱۹۴۷ء کے ہندو پاکستان فسادات کے لئے ہمیں سعادت حسن منٹو سے بات کرنا پڑتی ہے۔ کشمیر کی بڑی بی کے آنگن میں پچھلی صدی کے آخری دہے میں جو کچھ پیش آیا، وہ اِس کی کہنہ تاریخ میں بھی بہت بڑ بولا ہے لیکن اگر ہمارے بڑے شہروں اور چھوٹے دیہات میں اس کے باقی ماندہ مزارات شہداء یا اخباری تفاصیل سے اُن کی اصل بصیرت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ محض سطحی اور سرسری کیفیات اُبھارے گا۔ اِن کی تیز نوک تو صرف ہمارے ادب میں ہی اپنی شعلہ افگنی دکھاتی ہے۔ اگر چہ یہ بات بہت تکلیف دہ ہے کہ ابھی کشمیر کا مقامی ادیب اِس کے سارے خارِ مُغیلاں سے جھوجھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ غنیمت ہے کہ افسانوں کی دُنیا میں محی الدین ریشی کے بعد غلام نبی شاہدؔ کے زیرِ نظر مجموعے میں اس خار

زار کی خوں آشام لطافتوں کو سمیٹنے کے لئے پہل کی گئی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہمارے ادیب کا اس میدان میں کارنامہ یہیں تک محدود ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسے ادب کی افراط بھی نہیں ہے اور کشمیر میں کشتوں کے جو پُشتے لگتے رہے اُس کا سارا رزمیہ ابھی لوح و قلم کے کتنے ہی سفینوں کا انتظار کر رہا ہے۔

میں غلام نبی شاہدؔ سے ذاتی طور واقف نہیں ہوں اور اُن سے ملنے کی حسرت میں جی رہا ہوں۔ لیکن اُن کے اِن مختصر افسانوں نے اُنہیں میرا ایسا رمز آشنا بنالیا ہے کہ میں اُن کے احساسات کی آنچ سے تپنے لگتا ہوں۔ اُن کے زیرِ نظر افسانوں میں سے ہر ایک شاہکار تو نہیں ہے لیکن بعض افسانے پڑھ کر یقیناً کشمیر کے درد دِلا دوا کے بارے میں نایاب آگہی کے شعلے منظر کو خوفناک حد تک روشن کرتے ہیں۔ اس میں عزیز رشتہ داروں، دوستوں اور واقف کاروں کی ہلاکت اور اُن کے غائب ہو جانے کے جو تجربے بیان ہوئے ہیں، ان میں اندر کی ٹیس، دردِ جگر اور حیرت زا ماتم تو ہے لیکن رِقت اور آنسو بہانے کے انداز ٹالے گئے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ کشمیر کے اِس لالہ گوں دور کو ہماری اگلی نسلیں ایسے ہی ادب کی عینک سے دیکھ اور محسوس کر پائیں گی۔ کمال یہ ہے کہ اِن چھوٹی وارداتوں میں مشرقی ادیب کے من بھاتے کھاجے یعنی عورت اور اُس سے چھوا چھوت اور تاک جھانک کی بھی کوئی مہک یا لہک موجود نہیں ہے۔ اِن افسانوں میں مردوں اور بچوں (جو ایک خاص عمر تک Gender کی لحاظ سے غیر مُعین ہوتے ہیں) کے علاوہ عورتوں کے پیکر بھی بولتے چالتے اور مُتحرک نظر آتے ہیں۔ مگر وہ صنف کی سطح سے اوپر اُٹھ کر صرف آدم زاد کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں۔ دراصل کشمیر جیسی عالم آشوب ٹریجڈی میں زندہ رہنے کی بڑی جدوجہد میں

دوسرے جذباتی زاویئے کُند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کشمیر میں اِس قسم کے حادثے پہلے بھی ہوئے جب قحطِ عظیم کی بلاؤں نے اِنسان سے اُس کے لطیف احساس چھین کر اُسے زندہ رہنے کی تگ و دو کرتے پایا اور ہمارے ایک فارسی شاعر نے جب ماں باپ کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اِنسانی گوشت کو نوچنے سے بھی گریز نہ کرتے ہوئے پایا تو اُس نے حسرت بھری آہ بھرتے ہوئے کہا۔

ع زناں رامہر فرزنداں نہ بودہ

(ماؤں کے دِلوں میں اولاد کا پیار بھی نہ رہا تھا)

اِس مجموعے میں صورتِ حال کچھ اِس سے سنگین ہے کہ خود کشمیری باشندے کے ساتھ اجنبی فوجی کے سخت شدید جیک بوٹوں کی چاپ بھی جاری رہتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے علی محمد (درد کا دریا) اور مشتاق (پناہ) جیسے جیالے اور متوالے زندگی پسند لوگ بھی بھسم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ گولیاں، چیک آؤٹ، گرینیڈ دھماکے، تلاشیاں، بنکر، کرفیو اِس کیئر کے شناختی استعارے ہیں (ایک جگہ تو شاہد نے اِس بات پر تعجب دکھایا ہے کہ جب شہر میں کرفیو کے نفاذ میں کوئی رعایت نہیں دی جاری تھی۔ سورج کی کرن کیسے بغیر اجازت کے تاریک گلی کو منوّر کرنے آپہونچی)۔ یہ ساری باتیں زندگی کے ریل کی پٹڑی سے ڈھلک جانے کے اِشارے ہیں۔ بالکل اُس طرح جس طرح سعادت حسن منٹو کے زمانے کے فرقہ وارانہ بلوؤں نے عام زندگی کو تہس نہس کر دیا تھا۔ منٹو کے ادب میں اُس دور کی بڑی عبرت آمیز شہادتیں اکٹھی ہیں (ایک مبصر نے تو یہ تک لکھا کہ منٹو لاشوں کو اُلٹ پلٹ کر اُن کی اُنگلیوں سے انگوٹھیاں اور اُن کے کانوں سے جُھمکے اُتارتا چلا جاتا ہے)۔ موجودہ مجموعے میں اگرچہ

طرزِ منٹو کی کسی حد تک پیروی کی گئی ہے۔ لیکن اِس میں لاشوں کے کفن دفن پر لکھنے والے کے آنسوؤں کے سِتارے بھی جھلملاتے نظر آتے ہیں۔

میں اِس مجموعے کے چھوٹے سے افسانے ''آجادی'' کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا کہ اُس میں ایک غیر ریاستی پولیس انسپکٹر سُریندر تفریحاً اپنے ظلمی پروٹوکول سے اِنحراف کر کے کشمیری بچے کو Chips کے پیکٹ سے خوش کرنا چاہتا ہے۔ بچہ پیکٹ لے کر ضرور اپنے مُنہ کو میٹھا کرنے کے جتن کرتا ہے لیکن جب سُریندر اُس کو خوش دیکھ کر پوچھتا ہے ''شاباش، اب اور کیا چاہیئے'' تو بچہ بڑے اطمینان سے Chips کا مزہ لیتے ہوئے جواب دیتا ہے ''آجادی (آزادی)''۔

کیا کشمیریوں کے جذبۂ دِل کی اِس معصوم تفسیر سے زیادہ اور بہتر ترجمانی کی جا سکتی ہے؟ مجھے خوشی ہے کہ شاہدؔ نے اپنے بیانیئے کو غیر ضروری تکرار اور تواتر سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ اُس نے ہلکے پُھلکے انداز سے باتیں کرتے ہوئے آگے قدم بڑھایا ہے اور کم سے کم عبارت میں مفہوم کو ادا کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ جدید اُردو کے بڑے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔ جس کی وضاحت کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی جیسے ناقد نے کہا ہے کہ ''افسانے کی حمایت میں سب سے بڑی بات یہی ہو سکتی ہے کہ اِس پر غیر ضروری بوجھ نہ ڈالا جائے...... اگر افسانے کو اصناف کی محفل میں رُباعی کی سطح پر رکھا جائے تو ٹھیک ہے''۔ (افسانے کی حمایت میں)

دیکھئے کشمیر میں رہنے والے اُردو ادیب اِس تلقین کے کِس قدر حامی ہیں اور اس میں کتنے کامیاب۔ مجھے اس کتاب میں اردو کی سطح پر بھی ایک تسکین ملی کشمیر کا اردو ادیب

اپنے معاملات ومقامات کی نہ صرف سوجھ بوجھ رکھتا ہے بلکہ اُن کو بیان کی پوشاک پہنانے میں اپنے زمانے سے ہم آہنگ ہے۔ دُنیا کے اُردو دان طبقے کو کشمیر کی جذباتی اور احساساتی دُنیا کا عرفان بخشنے کے لئے اس قسم کے مجموعے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں جن میں اعداد وشمار اور ایام اور آثار کی نقشہ نویسی کے برعکس احساسات وجذبات کے اِنسانی گرافکس (Graphics) سے کام لیا گیا ہے۔

محمد یوسف ٹینگ
راولپورہ
۱۷ر جون ۲۰۱۳ء

............☆☆☆............

پیشِ نامہ

کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کا فن زیادہ پرانا نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ درنے با قاعدہ طور پر اس صنفِ ادب کا آغاز کیا اور کئی اچھے افسانے قلم بند کئے جو بالترتیب 'بہتے چراغ' اور 'کاغذ کا واسدیوٗ' کے نام سے دو کتابوں کی شکل میں شایع ہوئے۔ اس کے بعد ہمارے کئی افسانہ نویس اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے لیکن ان میں کوئی پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عباس، انتظار حسین یا احمد ندیم قاسمی پیدا نہیں ہو سکا۔ اس طرح ہم کفن، اَن داتا، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نظارہ درمیاں ہے، ایک چادر میلی سی، چھوئی موئی، آنندی اور گھر سے گھر تک جیسے لافانی شاہکاروں کی مثال پیش نہیں کر سکے۔ کیا اس کی یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ پردیسی اُردو ترقی پسند ادبی تحریک کے پیروکار تھے اور انہیں اُسی عہد ساز تحریک نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھانے کی طرف شدت سے راغب کیا۔ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تحریک کے ختم ہونے کے بعد ان کے قلم سے اور کوئی قابلِ ذکر افسانوی تخلیق سامنے نہیں آئی۔

گزشتہ دو تین دہائیوں میں اہلِ کشمیر کو جن خوف ناک اور خون آشام حالات سے گزرنا پڑا، اُن پر اگر چہ وقتاً فوقتاً مقامی افسانہ نگاروں نے خامہ فرسائی بھی کی لیکن ان

تخلیقات میں زیادہ تر ذاتی تعصب اور سیاسی نظریات ہی کو ملحوظ نظر رکھ کر ایسا ادب تخلیق کیا گیا جو آفاقیت اور ابدیت کا دعوی دار نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک کشمیری افسانے کا تعلق ہے اس کے حوالے سے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اس نے بہت حد تک عالمی ادب میں اپنا مقام حاصل کر کے دکھایا۔ اختر محی الدین، امین کامل، ہری کشن کول اور شنکر رینہ نے واقعی چند شاہکار افسانے پیش کئے۔

جب ساہتیہ اکادمی نے آج سے کوئی تیس چالیس سال قبل ہندوستان کی علاقائی زبانوں کی کہانیوں کا انتخاب انگریزی زبان میں شائع کیا تو اس میں شامل اختر کی کہانی .دلہن کا جوڑا.کو قارئین نے اس قدر پسند کیا کہ ایک مغربی نقاد نے اسے کتاب کا بہترین افسانہ قرار دیا۔

افسانے کی ہئیت کے بارے میں یہ رائے مسلمہ ہے کہ اس کے تین اجزا ہوتے ہیں جن میں آغاز، وسط اور اختتام یعنی عروج شامل ہیں۔ شروع میں افسانے کا آغاز ایک عام تخلیق کی طرح ہوتا ہے جو آگے بڑھتے بڑھتے سننے یا پڑھنے والے کے ذوق پر حاوی ہو جاتا ہے اور آخر پر اس کے عروج سے ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن دیر تک اس کے بارے میں ایک غیر متوقع سوچ میں محو ہو جاتا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعے میں 'آجادی' عنوان کی کہانی میں یہ ساری خصائص بدرجۂ اتم جلوہ گر ہیں۔

غلام نبی شاہد کا یہ افسانوی مجموعہ اعلان جاری ہے، اس پسِ منظر میں ایک قابلِ تعریف کوشش ہے جس کی وساطت سے شاہد نے کشمیر کی افسانوی ادبیات میں وقت سے پہلے ہی اپنا ایک مقام حاصل کیا ہے۔

اعلان جاری ہے، بائیس اُردو افسانوں کی ایک شیرازہ بندی ہے جو اُن دل گداز اور دل شکن حالات کی عکاسی کرتے ہیں جنہیں کشمیر دشمنوں اور سیاست کے سوداگروں نے شہہ دی اور جس کے نتیجے میں ہزاروں انسانوں کے خون سے یہ گلشنِ ارضی لالہ زار بن چکا ہے۔

افسانہ نگار نے دوسرے مصلحت کوش قلم کاروں کے برعکس تصویرِ کشمیر کو ہو بہو اسی شکل میں صفحۂ قرطاس پر منعکس کیا ہے جس طرح وہ اصل صورت میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ حقیقت نگاری اور بے لاگ تخلیقی عمل کا یہ مظاہرہ شاہدؔ کو دوسرے کئی ہم عصروں سے ممیز کرتا ہے۔

'مداوا' میں تشدد اور دہشت گردی کے ماحول میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ایک دھماکے میں زخمی ہو کر اپنا ایک بازو کھو بیٹھتا ہے۔ یہی کٹا ہوا بازو اس تخلیق کا مرکزی کردار بن چکا ہے۔

'آ جادی' کا موضوع انسان کی وہ فطری جبلت ہے جس کے سدا بہار پھول ایک سپاہی سے لے کر ایک پانچ سالہ بچے تک کے سینے میں کبھی نہیں مرجھاتے اور اس لافانی سرشت کا اظہار کسی نہ کسی طرح فطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ہوتا ہے۔ یہ افسانہ میرے نظروں میں مجموعے کا حاصل مطالعہ ہے۔

'درد کا دریا' افراتفری اور بدامنی کے مارے دوستوں کو اگر چہ ایک دوسرے سے الگ کر بھی لیتا ہے البتہ ان کے دلوں میں آپسی شفقت کی روشنی برابر تاباں ہے۔ تین مسکراتے ادھ کھلے پھول جیسے بچے مرجھا جاتے ہیں اور ان کا غم زدہ باپ بھی انہی سے جا ملتا ہے۔ یہ ایک اثر انگیز افسانہ ہے۔

'بازیافت' میں مصیبتوں کا مارا ایک نامراد باپ صرف یہ جان کر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ اگر اس کا گم شدہ بیٹا نہیں ملا ہے مگر اس کی قبر کا پتہ تو چلا ہے۔

'بوند بوند پیاسی' میں ایک شخص کو اس کے دفتر کے باہر ایک بچے کا بھیک مانگنا بہت برا لگتا ہے اور وہ اسے بار بار گندی نالی کا کیڑا کہہ کہہ کر دھتکارتا رہتا ہے۔ افسانہ اس وقت جھنجھوڑنے والے عروج پر اختتام پذیر ہوتا ہے جب اس خود پسند شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچہ دراصل اُسی کی ناجائز اولاد ہے۔

شاہدؔ نے اپنے افسانوں پر رنگ روغن چڑھانے کے لئے کسی قسم کی مصنوعی تزئین کاری سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ ذاتی رائے یا کسی تبصراتی ردِعمل کے اظہار کے بغیر حقائق کو شدید تر لہجے میں فن کارانہ اسلوب کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ان افسانوں میں انسانوں، کتوں اور بچوں کو جس خوبی سے کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے وہ قاری کے دل و دماغ پر اپنے ان مٹ نقوش ثبت کرتے ہیں۔

میرے قدر دان اور قلم کار دوست بار بار میرے پیچھے لگے رہتے ہیں کہ میں ان کے نثری مجموعوں یا شعری تخلیقات کا مطالعہ کر کے ان پر اپنا اظہار خیال کروں۔ اپنی گونا گوں مصروفیات کی بنا پر میرے لئے ان جائز خواہشات کو تشفی آمیز طور پر پورا کرنا ممکن نہیں۔ اسی پسِ منظر میں جب شاہدؔ کا یہ افسانوی مجموعہ میرے پاس لایا گیا تو میں نے اسے بھی ایک سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد اس پر اظہارِ خیال کا فیصلہ التوا میں رکھا۔ لیکن جب میں نے ایک یا دو افسانے غور سے پڑھے تو مجھے ان میں ہم عصر کشمیر کی تڑپتی اور پیاسی روح کی وہ صدائے بازگشت سنائی دی جو کسی بھی حساس شخص کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ یہ اس صنفِ

ادب کی ایک ایسی خوش کن صدا تھی کہ مجھے بے ساختہ منٹو اور کرشن چندر یاد آ گئے۔ لہٰذا میں نے اس وفورِ شوق مین اول سے آخر تک اس کا مطالعہ کیا اور اس احساس نے میری شادمانی کو دوبالا کیا کہ بہت دیر کے بعد کشمیر کی اردو ادبی دنیا سے کانوں کو ایک ایسی گونج سنائی دی ہے جس سے روح سرشار ہوئی ہے اور جس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

کشمیر میں معیاری اور اثر انگیز اردو افسانوں کی کمی ہے جسے شاہدؔ کی اس فن کارانہ کاوش نے موضوع اور طرزِ ادا کے ساتھ مجموعی لحاظ سے اپنی فنی صلاحیتوں کی بدولت کسی حد تک پورا کیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ تازہ ترین بیش بہا تحفۂ قارئین کے دلچسپ مطالعے کا باعث بنے گا تاکہ اس قلم کار کی بھی حوصلہ افزائی ہو اور اصحابِ دانش و بینش افسانہ نگاری کے فن کے حوالے سے اس مجموعے سے کچھ استفادہ بھی کر سکیں۔

غلام نبی خیالؔ

15۔ راولپورہ ہاوسنگ کالونی

سری نگر 1900005۔ کشمیر

(رابطہ: 9419005909)

باطن کی آنکھ سے ظاہر کا

مشاہدہ کرنے والا ''شاہدؔ''

غلام نبی شاہدؔ کشمیر کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ وہ کافی عرصے سے فن افسانہ نگاری کی آبیاری کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں رومانی کہانیاں لکھتے تھے لیکن دھیرے دھیرے ان کی سوچ اور فن میں پختگی آتی گئی۔ وہ اپنے افسانوں کے موضوعات اپنی زمیں سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کے افسانے مختصر اور پُر تاثیر ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے ان چھوٹے چھوٹے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جو سامنے کے ہوتے ہوئے بھی عام افسانوں کی نگاہ سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔ شاہد اپنے گردونواح کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی نظر سے معمولی سے معمولی واقعہ بھی نہاں نہیں رہتا۔

کشمیر پچھلے بیس سال سے جن خوں آشام حالات سے گزر رہا ہے شاہد نے زیادہ تر انہیں حالات سے اپنے افسانوں کے لئے موضوعات اخذ کئے ہیں۔ شاہد کے افسانے تجریدی یا علامتی نوعیت کے نہیں البتہ وہ اپنے کرداروں کی مختلف نفسیاتی کیفیات فنی خوبصورتی کے ساتھ ابھارتے ہیں۔

شاہد کے افسانوں میں وہ درد زیریں لہر کی طرح موجود ہے جو درد کشمیری قوم پچھلی دو دہائیوں سے اپنے سینے میں دبا کے جی رہی ہے۔

شاہد کے افسانوں میں پلاٹ سے زیادہ اہمیت بیانیہ کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاہد بحیثیت راوی کرداروں اور واقعات پر حاوی ہے۔ وہ خود کرداروں کے وسیلے سے نہیں بولتے بلکہ ایک غیر جانب دار راوی کی حیثیت سے قاری کو کشمیر کے زمینی حالات و واقعات سے ابھرنے والے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔

ان کی آنکھ کشمیر میں رونما ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو ایک کیمرے کی طرح گرفت میں لاتی ہے۔ پھر اپنے کرداروں پر مرتب ہونے والے نفسیاتی اثرات کو نہایت خوبی کے ساتھ قارئیں پر ظاہر کرتے ہیں۔

اس مجموعہ میں تقریباً سبھی افسانے مختصر ہیں۔ ان افسانوں کی خصوصیت ان کا اختصار ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ افسانے کا تاثر دیر تک قائم رہتا ہے۔ یہی ان افسانوں کی کامیابی کا راز بھی ہے۔ شاہد اگر چہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں لیکن یہ بسیار نویس نہیں۔ یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ مجموعہ ان کے کئی اور مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

رفیق راز

باغات برزلہ، سرینگر

۱۶ر جون ۲۰۱۳ء

............☆☆☆............

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ حال

اللہ کی اس تخلیق کائنات کی معمولی سے معمولی شئے میں ضرور کوئی نہ کوئی مقصد پوشیدہ ہے...... بالکل اسی طرح ہر تخلیق کار پھر چاہیے وہ ادیب ہو یا شاعر کی تخلیق میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ چونکہ وہ اپنے دور (عہد) کا گواہ ہوتا ہے۔جسے معاشرے کی آنکھ بھی کہا گیا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنے دور (عہد) میں رونما ہونے والی تمام سیاسی، معاشی، اقتصادی، نظریاتی، تہذیبی اخلاقی تبدیلیوں کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور جب بھی ان میں کسی ایک میں کچھ بگاڑ پیدا ہوتا ہے جسے معاشرے کا ایک عام فرد متاثر ہو کر درد سے کراہ اُٹھتا ہے۔ تو ایک تخلیق کار بغیر کسی خوف لالچ اور مصلحت کے اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے اور پوری شدت سے اپنی بات اپنی تخلیق کے ذریعہ سامنے رکھتا ہے۔ دنیا میں ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں جب ادیبوں اور شاعروں نے معاشرے کی آواز بنکر استحصال کرنے والوں کو ہلا کے رکھ دیا...... برصغیر میں بھی فیض احمد فیض سے لے کر اَرون دھتی رائے تک ادیبوں اور شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اپنے دور (عہد) کا گواہ بنکر پوری شدت سے اپنی بات سامنے رکھی۔

چونکہ دنیا میں تخلیق کار کے لئے شروع سے صرف اور صرف ایک ہی موضوع رہا ہے اور وہ ہے اللہ کی یہ کائنات آدم اور آدم سے مُنسلک مسائل......اللہ کی یہ تخلیق آدم، دنیا کے کسی بھی

خطے میں ہو......کوئی بھی زبان بولتا ہو......اُس کا رنگ کیسا بھی ہو......کوئی بھی نظریہ رکھتا ہو......
مگر بھوک ایک جیسی ہی لگتی ہے۔ زخم لگتا ہے تو خون بھی ایک جیسا ہی بہتا ہے......کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو آنسوؤں بھی ایک جیسے ہی نکلتے ہیں......اور سچا تخلیق کار آدم کے اِنہی زخموں سے بہتے خون اور آنکھوں سے جاری آنسوؤں میں اپنا قلم ڈبو کر اپنی تخلیق، تخلیق کرتا ہے۔

شروع سے ہی اپنے سامنے ادب کے وسیع سمندر کو دیکھ کر اکثر خوف سے دور کنارے ہی ریت کے ذرے برابر سمٹ کر رہ جاتا تھا۔ پھر شاید کچھ خانگی معاملات کچھ طبعیت اور کچھ دوسرے اَن دیکھے عوامل جیسے ایک ساتھ مل کر ادب کے اس وسیع سمندر کے کنارے ہاتھ پاؤں مارنے پر اُکساتے رہے......اور میں بے بس سا ہو کر کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کئے ہاتھ پاؤں ہلاتا رہا۔ جب آنکھ کھولی تو سامنے آگ اور خون کا ایک طویل دریا بہتا جا رہا تھا۔ میرے تنگ دامن میں یہ کہاں تک سما سکتا تھا؟ پھر بھی جو کچھ جیسے بھی اپنے دریدہ دامن میں سمیٹ سکا وہ پیشِ خدمت ہے۔

ادب سے میرا تعلق ہلکے پھلکے انداز میں غالباً سکول کے دنوں سے ہی شروع ہوا۔ جو بعد میں ایک واقعہ سے کچھ کچھ سنجیدگی اختیار کر گیا۔ ہندوہائی سکول شیتل ناتھ میں ساتویں یا آٹھویں میں سکول کے پاس ہی محلے کے چوک بزیہ کو جَن "لوکٹ بتہ ماٹکی صائبُن" میں واقع جنتا سٹیشنری ناول کرایہ پر دیتا تھا۔ دکان کے مالک مہاراج کا چھوٹا بھائی "سیٹھہ" میرا ہم جماعتی تھا۔ وہ اکثر شام کو جب دکان پر بیٹھتا تھا۔ میں بھی تھوڑی دیر گپ شپ کرنے بیٹھ جاتا۔ شاید اس وجہ سے مجھے بھی ناول پڑھنے کا شوق چُرایا......اور 'سیٹھہ' سے دوستی کی وجہ مجھے ناول مفت پڑھنے کا موقعہ ملا، ورنہ مہاراج نے ناول کرایہ پر دینے اور اس کا حساب کتاب رکھنے کے لئے باضابطہ ایک رجسٹر رکھا تھا۔ شروع میں چند جاسوسی ناول پڑھے، پھر منشی پریم

چند کا کوئی ناول پڑھنے کا موقعہ ملا۔ جو دل و دماغ پر چھا گیا۔ ناول پڑھنے کا یہ سلسلہ دو تین سال چلتا رہا۔ پھر ۱۹۶۸ء میں ہم نے دسویں کا سالانہ امتحان دیا تھا۔ غالباً چھٹیاں تھیں۔ میں ایک روز کسی کام سے لال چوک گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کچھ افراتفری پھیلی تھی۔ کالج لڑکے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کسی بات پر احتجاج کر رہے تھے۔ (کچھ سیاسی اُتھل پُتھل تھی۔ پس منظر مجھے اب یاد نہیں) دیکھتے ہی دیکھتے پتھراو شروع ہوا۔ اور میں نے واپس گھر کی راہ لی۔ مجھے ٹھیک یاد ہے۔ گاؤ کدل۔ پل پار کر کے بجلی محکمے کے عین سامنے دلیپ کو دوسری سمت سے آتے دیکھ کر میں سڑک پار کر کے اُس کے قریب گیا اور پوچھا۔ ''دلیپ تم کہاں جا رہے ہو''؟۔ وہ حسبِ عادت مسکراتے ہوئے بولا...... ''میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا تھا۔ چلو فلم دیکھیں گے''...... جواب میں، میں نے لال چوک میں پھیلی افراتفری اور پتھراؤ کے بارے میں بتایا۔ لیکن وہ فلم دیکھنے پر بضد رہا...... میں بھی نہیں مانا...... پھر وہ کچھ مایوس سا ہو کر بولا...... ''چلو ٹھیک ہے۔ فلم نہیں دیکھیں گے۔ میرے ساتھ آؤ۔ مجھے چپل کے Strips باٹا دکان سے لینے ہیں''...... میں نے معذرت ظاہر کی اور پھر واپس گھر چلنے کو کہا...... لیکن وہ باٹا دکان...... (لال چوک) جانے پر بضد رہا...... یں نے قدرے ناراض ہو کر گھر کا رخ کیا اور اُس نے لال چوک کا...... شام کو قدرے دیر سے میں گھر سے نکلا اور جنتا سٹیشنری کی دکان کے قریب پہنچا ہی تھا کہ محلے کا ایک لڑکا گُلہ کو چھے آیا اور کہا ''تمہیں معلوم نہیں تمہارا دوست دلیپ لال چوک میں پتھراؤ کے دوران مر گیا۔ ابھی اس کی لاش آنے والی ہے''...... پتہ نہیں میری کیا حالت ہوئی۔ کچھ دیر بعد قدرے اندھیرے میں اُس کی لاش اُس کے گھر ''نہر کوچہ'' لائی گئی...... عام لوگوں کی زبان پر یہی تھا کہ بچارا پتھراؤ کے دوران جان بچانے کی غرض سے ایس پی کالج یا ''ایس پی سکول'' کی لیبارٹری میں گھس گیا تھا۔ وہیں

سر پر ڈھنڈے کی ایک کاری ضرب سے اس کی موت واقع ہوئی...... دلیپ کلاس میں دوسرے لڑکوں سے زیادہ، مجھ سے قریب تھا۔ وہ روز گھر سے نکل کر میرے گھر آتا۔ وہاں سے دونوں اکھٹے سکول جاتے...... سکول کے بعد اور چھٹی کے دن اکھٹے گزارتے...... کچھ دن اُس کی موت کا بہت افسوس رہا۔ پھر سب کچھ معمولی پر آ گیا۔ اسی دوران میں نقل مکانی کر کے خانیار آیا۔ اور ۱۹۷۲ء میں آئی ٹی آئی میں ڈپلوما کے لئے داخلہ لیا...... اور ساتھ ہی خانیار میں شاہین تھیٹر کا ممبر بھی بنا، جو مرحوم ریاض گیلانی کے گھر کے عقب میں اُن کے ہی ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان میں تھا۔ آئی ٹی آئی میں حفیظ اللہ زاہد حسین اور رویندر درباری کو اپنا ہم مزاج پایا۔ ناول پڑھنے کے شوق نے چاروں کو ایس پی ایس لیبریری لال منڈی پہنچا دیا۔ مجھے آج بھی اپنا ممبر شپ نمبر ۱۱۳۲۹ یاد ہے۔ حفیظ اللہ کو مظہر الحق علوی کی رائیڈر ہگیرڈ کی انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں (ناول) پڑھنے کا جنون تھا۔ چند ایک میں نے بھی پڑھے۔ پھر منشی پریم چند کرشن چندر۔ عصمت چغتائی، گلشن نندہ، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ، پریم ناتھ پردیسی، حامدی کاشمیری۔ غلام رسول سنتوش۔ نسیم حجازی، صادق سردھنوی کے علاوہ جو بھی وہاں دستیاب تھا پڑھ ڈالا...... منشی پریم چند کا ایک ناول ''میدان عمل'' بہت دیر تک دل و دماغ پر چھایا رہا...... اسی دوران یا اس سے کچھ پہلے میں نے ایک عجیب خواب دیکھا جس میں دلیپ سکول جاتے ہوئے ہاتھوں میں ایک بڑے صاف شفاف شیشے کے مرتبان کی طرف کچھ روٹھے ہوئے انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے...... ''ژ دِکھ نا-تھ سگ'' (تم اسے سینچو گے نہیں)؟ میں شیشے کے مرتبان کی طرف دیکھتا ہوں۔ جس میں نچلی تہہ پر بالکل درمیان میں ایک چھوٹا خشک مٹی سے لدا پودا رکھا ہوا ہے جس کی پتلی پتلی سوکھی جڑیں مرتبان کی سطح پر کچھ دائیں بائیں پھیلی اور کچھ لٹکی ہوئی

ہیں...... یہ سب دیکھ کر میں دلیپ کی طرف دیکھ کر پورے اعتماد سے کہتا ہوں"......

"آ.. بہ دِمہٕ اَتھ سگ" ہاں۔ (میں اسے ضرور سینچوگا)...... یہ خواب میں نے ہفتے میں تین بار دیکھا، یہ ماجرا کیا ہے سمجھنے سے آج بھی قاصر ہوں۔ کچھ دن خواب اور دلیپ کے بارے بہت سوچا۔ جس کے دوران ایک دن دلیپ کے گھر بز یہ کو جن "نٔبر کوچہ" بھی گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دروازے سے ہی لوٹ آیا...... کچھ دن بعد خواب بھول گیا۔ لیکن دل ودماغ پر کچھ بوجھ سا محسوس کرنے لگا۔ کچھ دن بیمار بھی رہا...... جس کی وجہ کچھ اور رہی ہوگی۔ مگر میں اس کی وجہ خواب ہی سمجھتا رہا...... جس سے دل ودماغ پر بوجھ دوہرا ہو گیا۔ چونکہ شام کو تھیٹر جانا معمول تھا اور وہاں بیٹھ کر مجھے کچھ دیر کے لئے اس انجانے بوجھ سے کچھ دیر کے لئے نجات ملتی تھی۔ ایک روز تھیٹر سے آ کر اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے پھر دلیپ اور خواب کے بارے میں سوچنے لگا اور یونہی قلم ہاتھ میں لے کر دلیپ کے بارے میں کچھ لکھتا رہا۔ جس کے دوران خود کو کچھ ہلکا سا محسوس کرنے لگا۔ چار پانچ صفحے لکھنے کے بعد انہیں سرسری نظر سے پڑھا کچھ کچھ افسانے کا خاکہ لگا۔ دو چار بار پڑھنے کے دوران محسوس ہوا دل ودماغ سے جیسے سارا بوجھ اُتر گیا۔ "ماں کا خواب" عنوان دے کر دوسرے دن تھیٹر میں شیخ مشتاق صادق۔ محمد شفیع وائیدہ مرحوم ریاض گیلانی اور یعقوب دلکش کو سنایا۔ سب نے کہا "یہ تو افسانہ ہے"...... چونکہ تھیٹر کی وجہ سے ریڈیو کشمیر (یُو واوانی) تک رسائی تھی۔ میں دوسرے دن کاپی لے کر جنرل سروس "ریڈیو کشمیر" میں ادبی پروگرام کے انچارج مرحوم بشیر شاہ کے کمرے میں داخل ہوا اور بغیر کسی تمہید کے کاپی اُن کے سامنے کھول کے رکھ دی۔ مرحوم نے کاپی دیکھ کر قدرے مسکراتے ہوئے افسانہ پڑھا اور کہا...... "یہ تو اچھا افسانہ ہے۔ لیکن اسے ایسے نہیں لکھتے۔ تم اسے ریکاڈنگ کے لئے صفحے کے صرف ایک طرف لکھ کر لاؤ"۔ مجھے یاد نہیں بعد

میں ریکاڈنگ کے لئے میں ریڈیو گیا کہ نہیں۔ لیکن یہ طے تھا کہ میرا ادب کے وسیع سمندر کے کنارے ہاتھ پیر مارنے کی شروعات ہو چکی تھی اور غالباً ۷۴-۱۹۷۳ء کے دوران میرا پہلا افسانہ ''کتنے جھنڈے'' کے نام سے روز نامہ آفتاب میں شائع ہوا۔ جس کی وجہ سے میں تھیٹر میں یعقوب دلکش اور مشتاق مہدی کے اور قریب آ گیا۔ مشتاق مہدی کی ایک کہانی وادی سے باہر کسی رسالے میں شائع ہو چکی تھی۔ یعقوب دلکش کو کشمیری افسانہ کے علاوہ سٹیج ڈرامہ لکھنے اداکاری اور ہدایت کاری سے بھی دل چسپی تھی۔ تھیٹر میں دوسرے تمام ممبر ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہے جن میں محمد شفیع وائیدہ، شیخ مشتاق صادق، مرحوم ریاض گیلانی، مسعود الحسن (منہ صائب) پیش پیش تھے۔ باقی ممبران میں گل محمد، علی محمد مہرازا، نثار احمد، حبیب اللہ صلاتی (حبہ) نذیر احمد راتھر، غلام نبی خان، اے آر رشید، چائلڈ آرٹسٹ اشتیاق علاقبند، غلام محمد وانچو، محمد یعقوب نقاش، شوکت علی خان (شوپیاں) نذیر احمد (حبہ کدل) شاہینہ جی، زمرودہ جی، عبدالحمید بیگ، منظور شبنم، رشید فردوسی، غلام قادر ہماری کہانیاں سنتے رہے اور ہمیں حوصلہ دیتے رہے...... اور ساتھ ہی ہم تینوں نے ایک دوسرے کے گھر میں ''گوٹھی مٹینگہ'' محفلیں شروع کیں اور انہی مٹینگوں کے نتیجے میں ۷۶-۱۹۷۵ء میں ''مٹی کے دیئے'' شایع کی جس کا سرورق اور پیشِ لفظ جناب سجود سیلانی نے ترتیب دیا۔ ''مٹی کے دیئے'' شائع ہونے کے چند ہی مہینے بعد ہم تینوں کو تلاش ادب کی ایک ادبی نشست میں شرکت کرنے کا موقعہ ملا...... جو ستھو بربرشاہ کے آس پاس ہی ایک گرلز سکول میں منعقد ہو رہی تھی۔ آگے چل کر تلاش ادب سے وابستہ ممبران عمر مجید، جاوید آذر، خالد بشیر، رفیق ہمراز، سجاد حسین، فاروق آفاق، فیاض دلبر، رشید فراق۔ ایس ایم قمر، ذہین علی، شمس الدین شمیم، جان محمد آزاد، الطاف ناو پوری، فرید پربتی، مجروح پوربی۔ چندن سنگھ، خالد حسین، حیدر علی ہادی، علی محمد ماہر، عبدالحمید

مہربان، بشیر اطہر جیسے ادیبوں اور شاعروں سے متعارف ہوئے...... تلاش ادب کی ادبی نشستیں مہینے کے ہر دوسرے سنیچر وار کو بسکو سکول میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔جن کا اہتمام عمر مجید خود کیا کرتے تھے۔مجھے یاد ہے ایک ادبی نشست میں، میں نے کوئی افسانہ پڑھا۔بعد میں افسانے پر بات کرتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں اسی قسم کا خوبصورت افسانہ پڑھنے کو دوں گا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے چند دن بعد مجھے ڈاک کے ذریعے اُن کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک خوبصورت خط کے ساتھ ''شب خون'' میگزین ملا اور مجھے وہ خوبصورت یادگار افسانہ ''میں بوند بوند زہر پیتا ہوں''۔از موہن لعل، پڑھنے کا موقعہ ملا...... تلاش ادب کی کچھ یادگار محفلیں اسلام آباد میں بھی منعقد ہوئیں جہاں ہم زاہد مختار، عطا محمد، قاسم سجاد، بشیر دادا مقبول ویرے کے علاوہ اور بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے متعارف ہوئے۔اسی دوران یہ بھی ایک معمول بن گیا تھا کہ تقریباً ہر اتوار کو تلاش ادب سے وابستہ کچھ دوست صبح سویرے سے ہی جاوید آذر کے گھر ''کورٹ روڈ'' کا رخ کرتے اور شاید تیسری یا چوتھی منزل پر ایک قدرے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر دنیا جہاں کے ادب، سیاست، سماجیات، اقتصادیات، اخلاقیات جیسے موضوعات پر زوردار بحث مباحثہ اور تبصرے شروع ہو جاتے جس کے دوران وقفے وقفے سے مشتاق چائے کا سماوار لے کر خاموشی سے کمرے میں داخل ہوتا اور چائے کے دوران خاموشی سے جاری بحث سنتا رہتا۔پھر خاموشی سے خالی سماوار لے کر کمرے سے نکل جاتا...... پھر ایک دن وہ اچانک اسی خاموشی کے ساتھ بہت دور نکل گیا......اب یاد کرتے زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے۔

''کیا بگڑتا تیرا جو نہ مرتا کوئی دِن اور''

خیر یہ گرم گرم محفلیں پھر رات دیر گئے کچھ ٹھنڈی پڑ جاتی جن میں اکثر شبیر احمد، اعجاز بانڈے، مظفر، فاروق احمد، جاوید احمد بھی شریک رہتے تھے۔ کبھی کبھی شام کے وقت جہلم کنارے بنڈ پر چہل قدمی کے دوران بھی کسی ادبی موضوع پر بحث جاری رہتی...... جاوید آذر آج کل جتنے کم یاب ہیں اُن دنوں اتنے ہی دستیاب رہتے تھے اور اس کے ساتھ اکثر شامیں کوکر بازار کے بغل میں واقع خورشید صاحب کے چھوٹے سے ریسٹورنٹ پولکا (Polka) میں بھی گزرتی تھیں۔ جہاں رات دیر گئے تک شاعر، ادیب اور سٹیج سے وابستہ دوسرے آرٹسٹ حضرات بغیر کسی وقفہ کے چائے کی ایک پیالی کے عوض عالمی ادب خاص کر جدیدیت کے موضوع پر بحث کے علاوہ عالمی سیاسی مسائل کا حل فیصلہ کن مرحلے تک پہنچا کر ہی دم لیتے اور دوسرے دن شام سے یہ سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہو جاتا۔ چونکہ خورشید صاحب ''گڈی'' خود ادب نواز تھے اور شاید اسی وجہ سے کچھ عرصہ تک یہ صورت حال برداشت کرتے رہے، پھر جب پورا یقین ہو گیا کہ اتنے بڑے عالمی مسایل کا حل چائے کی ایک پیالی سے ممکن نہیں تو اُنہوں نے خاموشی سے اپنا فیصلہ سُنا دیا اور پولکا ''Polka'' کو زیرو اِن (Zero Inn) منتقل کر دیا۔ لیکن ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا...... اسی دوران تلاش ادب ''رائٹرس کلب'' کے نام سے اخبار ''آفاق'' کے دفتر واقع ریڈ کراس روڈ منتقل ہوا...... جہاں اور ادبی نشستوں کے علاوہ کچھ یادگار محفلیں جن میں ''ایک شام پروفیسر رحمان راہی اور جناب حامدی کاشمیری کے ساتھ بھی منعقد ہوئیں۔ اس دوران میرا لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور میرے افسانے روز نامہ آفتاب میں شایع ہوتے رہے اور انہی دنوں ریاض معصوم قریشی سے بھی ملاقات ہوئی جن کا ایک عدد ناول ''خیالوں کے قفس'' میں شایع ہو چکا تھا۔ چونکہ میرے اور یعقوب دلکش کے ہمسائیگی میں ہونے کی وجہ

سے ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوا جہاں ہم ادب کے حوالے سے افسانہ، ڈرامہ وغیرہ پر خوب بحث مباحثہ کرتے تھے جو ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔

۸۰-۱۹۷۹ کے آس پاس میں اپنا پہلا کشمیری ڈرامہ ''انقلاب'' لے کر ریڈیو کشمیر، ڈرامہ انچارج جناب پران کشور سے ملا۔ اُنہوں نے میرے سامنے ہی ایک ہی نشست میں ڈرامہ پڑھ کر میرے لکھنے کے محرکات کے بارے میں پوچھا۔ جس کے جواب میں، میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنے مختصر ادبی پس منظر کے متعلق اور ڈرامہ ''انقلاب'' جو شاید میں نے مرحوم علی محمد لون کے مشہور ڈرامہ ''میانہ جگر کہِ دادِ وو تھ'' سے متاثر ہو کر لکھا تھا، بتا دیا......

مجھے یاد ہے وہ اپنی کرسی سے اُٹھے اور میرے قریب کھڑے ہو کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی مخصوص آواز سے میرے کانوں میں رس گھولتے ہوئے بولے۔ ''تمہارا یہ ڈرامہ بہت اچھا ہے۔ یہ عنقریب ہی نشر ہوگا۔ تم جتنے ڈرامہ لکھ سکتے ہو۔ لکھو؛ میں انہیں پیش کرونگا''۔

ان رس گھولتی چند باتوں اور شانے پر اُن کے ہاتھ کے لمس کو اب برسوں بیت گئے ہیں۔ لیکن اُن چند باتوں کی مٹھاس اور شانے پر اُن کے ہاتھ کے لمس کو آج بھی اُسی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ آگے چل کر میں متواتر ریڈیو کے لئے لکھتا رہا جس کے ساتھ ساتھ کشمیری اور اردو میں افسانہ بھی لکھتا رہا ۹۱-۱۹۹۰ء کے آس پاس مرحوم شمس الدین شمیم اور یعقوب دلکش کے کہنے پر ٹیلی ویژن کا رخ کیا اور یہاں بھی خوش قسمتی سے شبیر مجاہد، مفتی ریاض، بشیر قادری، جاوید اقبال۔ محمد یوسف پرے، محی الدین، شوکت گیلانی، ناصر منصور، محمد صدیق، عبدالغنی، پرویز سجاد، ڈاکٹر نذیر مشتاق، مشتاق احمد مشتاق، اقبال قریشی جیسے مخلص دوست ملے جن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میرا آج بھی ٹی وی اور ریڈیو سے رشتہ قائم ہے۔ تاہم مجھے تشفی ہمیشہ افسانہ لکھنے سے ہی ہوئی، شاید اسی وجہ سے کہ میرا اصلی رجحان افسانے کی طرف رہا ہے۔

جاوید آذر نے کشمیر عُظمیٰ کی ادارت سنبھالتے ہی اخبار کی دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وادی میں سُونے، ساکت، بکھرے ادبی ماحول کو پھر سے متحرک کر کے اس میں رنگ بھرنے کی کوششیں شروع کیں۔ وہ اس میں بہت سنجیدہ تھے۔ مجھے بھی کہانی لکھنے کو کہا، میں کچھ دیر اپنی تساہل پسندی کی وجہ سے ٹالتا رہا۔ لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور مجھ سے کہانی لکھواتے ہی دم لیا۔ اور آگے بھی لکھواتے رہے، تھوڑے ہی عرصے میں اُن کی کوششیں رنگ لائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کشمیر عُظمیٰ نے وادی کے سُونے بکھرے ادبی منظر نامے کو ہرا بھرا کر دیا۔ جس کو آگے چل کر جناب نور شاہ کی صدارت میں جموں کشمیر اردو اکادمی کی سرپرستی میں منعقد ادبی محفلوں، سمیناروں اور دوسری ادبی سرگرمیوں نے اور نکھار دیا......اور شاید یہ پہلی بار ہوا کہ وادی سے کسی غیر سرکاری ادبی تنظیم نے اپنا سہ ماہی کتابی سلسلہ شروع کیا ہو، جو اُمید ہے آگے چل کر جموں کشمیر میں اُردو کے بہتر مستقبل کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

میری بیشتر کہانیاں کشمیر عُظمیٰ میں شایع ہوئی ہیں۔ اگر کبھی کسی وجہ سے کہانی لکھنے میں کچھ زیادہ تاخیر ہو جاتی تو جاوید آذر اچانک کہیں سے نمودار ہو کر مجھے پھر پٹری پر لے آتے...... جب خود کچھ زیادہ ہی عدیم الفرصت ہو گئے تو یہ کام سلیم سالک کو سونپ دیا، جو تاحال یہ فرض بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں اور اسی کے نتیجے میں یہ کہانیاں جمع ہو کر کتابی شکل میں آپ تک پہنچ رہی ہیں۔

میں یقیناً خوش قسمت ہوں مجھے اپنے دور کے چند قد آور ادبی شخصیات کی لکھی ہوئی چند بیش بہا تحریریں نصیب ہوئیں۔ جن میں جناب نور شاہ، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب غلام نبی خیال، جناب رفیق راز شامل ہیں۔ جن کا سیدھے سادھے الفاظ میں

صرف شکریہ ہی ادا کرسکتا ہوں اور خاص طور سے جناب محمد یوسف ٹینگ اور جناب غلام نبی خیال کا بہت ہی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے جانے پہنچانے بغیر میری کہانیوں کو سنجیدگی سے لیا۔ اپنا قیمتی وقت نکال کر اُنہیں پڑھا اور خالص ادبی نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیا، میری بہت سی کمیوں کو نظرانداز کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

اپنے اس تھوڑے سے ادبی سفر کے دوران جب بھی کچھ لکھنے بیٹھا تو دلیپ کو شیشے کا مرتباں ہاتھوں میں تھامے سامنے پایا......اُسے مرے ہوئے اب ایک زمانہ ہوا ہے۔ اس دوران میرے اپنے بہت سے عزیز، قریبی رشتہ دار اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ وہ کب کے قبروں میں مٹی ہو چکے ہونگے، اُن کی صورتیں دِل و دماغ سے بالکل اُتر گئی ہیں، یاد کرنے پر مشکل سے اُن کے کچھ کچھ ہلکے ہلکے نقوش ہی ذہن میں اُبھر آتے ہیں......لیکن دلیپ کا نام ذہن میں آتے ہی، پندرہ، سولہ سال کا ایک ہنستا مسکراتا لڑکا سامنے آ کر کھڑا ہوتا ہے......ایسا کیوں......؟ میں شاید ہی کبھی سمجھ پاؤں......شروع شروع میں ایک دن خود سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر زندگی میں کبھی کچھ لکھ پایا تو اُسے دلیپ کے نام منسوب کرونگا...... یہ چند کہانیاں لکھ کر میں نے کوئی بڑا ادبی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے۔ اس لئے کہ مجھے اپنی تنگ دامنی کا پوری طرح احساس ہے پھر بھی صرف اپنی تسلی کے لئے، ایک معصوم سوال، جو مجھ سے خواب میں پوچھا گیا، کے جواب میں وعدے کے مطابق ان کہانیوں کو دلیپ کمار نہرو کے نام منسوب کرتا ہوں یہ سوچ کر کہ شاید یہی اُس خواب کی تعبیر ہو......!!!

احقر

غلام نبی شاہد

۷؍جون ۲۰۱۳ء

مداوا

فجر کی اذان مکمل ہوتے ہی، جمیلہ نے کروٹ بدلی، جیسے کہ وہ اذان کے ختم ہونے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ چند لمحے وہ اِسی طرح بے حس وحرکت پڑی رہی۔ آنکھیں بند کرنا چاہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے اسے خوف سا محسوس ہوا۔ دھیمی روشنی میں کمرے کی ہر شئے اسے دور بھاگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا خاوند محمد افضل وضو کے لئے کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح خالی خالی نظروں سے کمرے کو دیکھتی رہی جس کے دوران اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ اپنا آپ اندر سے کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا، گھبراہٹ اور خوف میں اس نے خاوند کو بلانے کے لئے پوری قوت سے پکارنا چاہا۔ منہ کھولا، مگر اس کی پکار ایک دردناک چیخ میں تبدیل ہوگئی۔ جس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود ہر شئے بھی جیسے چیخنے لگی۔ اس نے عجیب انداز میں ایک تکیہ اٹھا کر سینے سے بھینچ لیا اور پاگلوں کی طرح، جاوید...... جاوید...... میرے لعل...... میرے جگر...... مجھے بھی اپنے پاس بلا لو، کہتے کہتے کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگی۔ اسی دوران محمد افضل وضو سے فارغ

ہو کر غسل خانے سے باہر آیا۔ بیوی کی چیخیں سن کر وہ تذبذب اور پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد چیخیں سسکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مسجد کا رخ کرے یا کمرے کا......

پانچ دن پہلے ان کا اکلوتا بیٹا کمپیوٹر سنٹر سے واپس گھر آتے ہوئے مین روڈ پر ایک دھماکے میں اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ یہ خبر دونوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ دھماکے کی زوردار آواز سے سارا محلہ لرز اٹھا تھا۔ آس پاس کے مکانوں کی صرف دیواریں ہی ٹوٹ گئی تھیں۔ لیکن محمد افضل کی پوری زندگی زمین بوس ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ رات ان پر قیامت بن کر گزری تھی۔ بڑی مشکل سے کل رات جمیلہ کو قدرے ہوش آیا تھا اور بڑے صبر اور ضبط سے اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ محمد افضل کو بھی بیوی کے اس صبر پر قدرے اطمینان سا ہوا تھا۔ ''اس وقت اسے پھر جاوید کی یاد آئی ہوگی''۔ سوچتے ہوئے وہ یونہی بے بسی کے عالم میں غسل خانے کے دروازے سے لگ کر کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سسکیاں بند ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اسی دوران ایک اور زوردار چیخ کے ساتھ کمرے سے پھر زور زور سے رونے کی آواز آنے لگی۔ محمد افضل دل پر پتھر رکھ کر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھا جیسے کہ کسی غیبی مدد کا متلاشی ہو۔ وہ اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اُسے معلوم تھا، اس وقت اس میں جمیلہ سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ اس وقت اسے کیا دلاسا دے گا۔ کیا تسلی دے گا۔ سوچتے سوچتے وہ بیڈروم کے قریب پہنچ گیا۔ دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر کی طرف تھوڑا کھل گیا۔ کمرے کی دھیمی روشنی میں جمیلہ تکیہ میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بیوی کو اس حال میں دیکھ کر

محمد افضل اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ پھر ہمت جٹا کر وہ آگے بڑھا اور جمیلہ کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا ہوا۔ جمیلہ خاوند کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ محمد افضل نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ ابھی خود کو سنبھال رہا تھا اور ساتھ ہی اُسے تسلی دینے کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا کہ اچانک جمیلہ جیسے پھٹ پڑی۔ ''جاوید کو کہاں چھوڑ آئے......کہاں چھوڑ آئے میرے جگر کو...... مجھے جواب دو......تم نے......'' کہتے ہوئے وہ پھر زور زور سے رونے لگی۔ محمد افضل بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ وہ نیچے بیٹھ کر بے بسی کے عالم میں اُسے دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر ضبط کر کے جمیلہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے کہہ پایا۔ ''جمیلہ حوصلہ رکھو......ہم سب اللہ ہی کے......'' کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی۔ خاوند کے یہ الفاظ سن کر جمیلہ چپ ہو گئی۔ سر خاوند کی گود میں رکھ دیا۔ چند لمحے وہ اسی طرح رہی پھر کافی ضبط کر کے عجیب انداز میں خاوند سے مخاطب ہوئی۔ ''میں نے ابھی جاوید کو خواب میں دیکھا۔ اس کے ساتھ اس کے اور بھی دوست تھے۔ ان کے جسموں سے عجیب خوشبو آ رہی تھی''۔ ''اچھا......'' محمد افضل جیسے بے یقینی کے عالم میں بولا۔ ''ہاں......اس خوشبو کا احساس مجھے اب بھی ہو رہا ہے، لیکن......لیکن'' جمیلہ کہتے کہتے پھر رو پڑی۔ محمد افضل کچھ نہ سمجھتے ہوئے تذبذب اور حیرانی میں جمیلہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مُردہ آواز میں پوچھا۔ ''لیکن کیا''......''اس کا داہنا ہاتھ نہیں ہے......کہہ رہا تھا۔ اسے ڈھونڈ کے لاؤ''۔ یہ کہتے ہوئے جمیلہ پر غشی سی طاری ہوئی اور محمد افضل کی جیسے روح ہی نکل گئی۔ ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ اپنا آپ زمین کے اندر دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ نظریں سامنے سرہانے رکھے قرآن شریف پر

پڑتے ہی آنکھوں سے آنسوں کی ایک نہ تھمنے والی دھار نکل کر اُس کے چہرے کے ساتھ ساتھ جمیلہ کے رخساروں کو بھی تر کر گئی جس سے اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی جُنبش ہوئی۔ محمد افضل نے سامنے کے شلف سے ایک دوائی کی ٹکیہ اُٹھائی اور جمیلہ کے منہ میں رکھ دی۔ جسے جمیلہ نے پانی کے ایک گھونٹ کے ساتھ حلق کے نیچے اُتار لیا......اور اُس کا سر اُٹھا کر بائیں طرف تکیہ پر رکھ دیا۔ جس سے محمد افضل کو تھوڑا سا اطمینان ہوا۔ پھر نماز کا خیال آتے ہی اپنی ساری قوت مجتمع کر کے وہ دروازے کی سیدھ میں کھڑا ہو گیا......اور پوری قوت سے پہلے ایک قدم آگے بڑھایا، پھر دوسرا اور کسی طرح وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ مسجد کے اندر پہنچ کر وہ اچانک ٹھٹھک گیا۔ اسے یاد آیا کہ دھماکے کے بعد ہمسایوں نے اسے پورا یقین دلایا تھا کہ انہوں نے جاوید کے سارے اعضاء اکٹھا کر کے دفنائے......لیکن...... ہاتھ...... اسے پھر اپنا آپ گرتا ہو محسوس ہوا۔ لیکن ساتھ ہی اکامت نے اسے سہارا دیا۔ وہ جماعت میں شامل ہوا۔ نماز کے دوران بیٹے کا داہنا ہاتھ شکلیں بدل بدل کر اس کے سامنے پھرتا رہا۔ اُس کے بچپن سے لے کر جوانی تک اس نے اس ہاتھ کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ایک ایک انگلی کو غور سے دیکھتا رہا......اسے یاد آیا اس نے کتنی بار اس ہاتھ کو چوما۔ اس سے سہارا لیا، اس کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ انگلیوں میں کیسے قلم پکڑتا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہمسایوں خاص کر حاجی صاحب اور عبدالصمد سے ضرور پوچھے گا کی انہوں نے واقعی جاوید کے تمام اعضاء اکٹھا کئے تھے۔ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ سب لوگ مسجد سے باہر آئے۔ وہ دیر تک ایسے ہی مسجد میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب باہر آیا......سورج قریب قریب طلوع ہو چکا تھا۔ وہ مسجد کے صحن سے باہر آیا۔ دو تین قدم گلی میں آگے بڑھا۔

پھر اچانک رُک گیا۔ جیسے آگے گہرا اندھیرا چھایا ہو، جس میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا
تھا۔ صبح کا واقعہ پھر یاد آیا اور ساتھ ہی جمیلہ کے کہے الفاظ ''وہ کہہ رہا تھا، میرا دا ہنا ہاتھ وہیں
کہیں پر پڑا ہے، اسے ڈھونڈ کے لاؤ''......اس کی روح کو چھلنی کرنے لگے۔ وہ دیوانوں کی
طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور مسجد کے ساتھ والی گلی میں مڑ گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ مین روڈ پر
اس جگہ پہنچ گیا، جہاں پانچ دن پہلے دھما کہ ہوا تھا۔ یہ جگہ برلب سڑک تھی تاہم آگے چل کر
کچھ اُترائی تھی۔ جہاں خودرو جھاڑیاں بکثرت اُگ آئی تھیں۔ جس کے ساتھ ہی کوڑے
کرکٹ کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ بے ہنگم درختوں کے جُھنڈ نے اس جگہ کو قدرے نیم
تاریک بنا دیا تھا۔ محمد افضل چند لمحے سڑک سے نیچے خودرو جھاڑیوں کو غور سے دیکھتا رہا۔
اندر ہی اندر ہمت جتا کر نیچے اُترا اور نیم تاریکی میں پوری شدت سے دونوں ہاتھوں سے
جھاڑیوں کو توڑنے، اکھاڑنے لگا۔ وہ بہت دیر تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک
جھاڑ جھنکاڑ کاٹتا رہا، اکھاڑتا رہا لیکن اسے وہاں کچھ نہ ملا۔ پھر تھک ہار کر کوڑے کے ڈھیر
کے قریب پہنچا، اسے بھی کھنگال ڈالا۔ لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ حالت بھی عجیب تھی۔
کانٹے دار جھاڑیوں سے اُلجھ کر بازوں، ہاتھوں اور چہرے سے جگہ جگہ خون رِس رہا تھا۔
کپڑے تار تار تھے۔ تذبذب اور بے بسی کے عالم میں اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا، جیسے
یقین ہو کہ، وہ یہیں کہیں پڑا ہے۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا دن اچھا خاصا نکل آیا تھا۔ اچانک
اسے جمیلہ کا خیال آیا اور تیز تیز قدموں سے اوپر سڑک پہ آیا اور گھر کا رخ کیا۔ گھر کے قریب
پہنچ کر دروازہ باہر سے بند دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ چند لمحے دروازے کو دیکھتا رہا۔ دل میں
ہزاروں وسوسے ایک ساتھ اُمڈ آئے۔ کچھ سوجھا نہیں کیا کرے...... ہمت جتا کر دروازہ کھولا

اوراوپر والے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں ہر چیز اپنی جگہ قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ تاہم قرآن شریف اب بیڈ کے ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ لیکن...... جمیلہ کہاں گئی، سوچتے سوچتے وہ تذبذب اور پریشانی میں کمرے سے باہر آیا۔ باہر ہمسایوں سے معلوم کیا۔ قریبی رشتہ داروں کے یہاں گیا۔ دُور دُور تک محلے کے اطراف میں ڈھونڈا لیکن جمیلہ کا کوئی پتا نہیں چلا۔ کسی سے پوچھا بھی، لیکن وہ بس دیکھتے رہے جواب نہ بن پڑا۔ چلتے چلتے پیر منوں بھاری معلوم ہو رہے تھے۔ گرتے پڑتے مسجد کے قریب پہنچ گیا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو مسجد کے اندر داخل ہوا۔ دروازے کے قریب ہی جیسے سجدے میں گر گیا۔ دیر تک اسی حالت میں رہا۔ دور کسی دوسری مسجد سے ظہر کی اذان کے ساتھ ہی اس نے سر اُوپر اٹھایا، نہ جانے کیوں دل کو قدرے اطمینان سا میسر ہوا تھا۔ ڈوبتے بھاری قدموں سے پھر گھر کا رخ کیا۔ دروازہ کھلا تھا، اوپر کمرے میں پہنچا۔ وہاں جمیلہ بہت ہی سکون کے ساتھ تلاوت کر رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بے یقینی کے عالم میں اس کے قریب آیا۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھنا ہی چاہا کہ جمیلہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کے تاثرات تھے جنہیں وہ سمجھنے سے قاصر تھا، ''اتنی دیر کہاں لگا دی''۔ اسے جمیلہ کی آواز جیسے بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ ''وہ ادھر امانت پڑی ہے، پہنچا دو''...... جمیلہ نے کہتے ہوئے کمرے میں ایک طرف رکھی چھوٹی میز کی طرف اشارہ کیا، محمد افضل نے نہ چاہتے ہوئے ادھر دیکھا۔ میز پر ایک چھوٹے سے سفید تھیلے میں کوئی چیز بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ محمد افضل چند لمحے خالی خالی آنکھوں سے سفید تھیلے کو دیکھتا رہا پھر اچانک جیسے کسی نے اس کا کلیجہ دونوں ہاتھوں سے زبردستی کھینچ کر جسم سے

باہر نکال دیا۔ وہ تھیلے کو دیکھتے دیکھتے وہیں نیچے بیٹھ گیا...... ”جب تم بہت دیر تک نہیں لوٹے، میں نے قرآن پاک اتار کر تلاوت شروع کی۔ جس کے دوران مجھے اونگھ سی آ گئی۔ میں نے پھر جاوید کو دیکھا، کہہ رہا تھا، ابو کو میرا ہاتھ نہیں مل رہا ہے۔ امی تم جاؤ، وہ ٹھیک بڑے پیڑ کی ایک نچلی والی موٹی شاخ پر پڑا ہے“۔ کہتے کہتے جمیلہ کی آواز رُندھ گئی۔ لیکن اس نے ساتھ ہی زور سے پھر تلاوت شروع کی۔ محمد افضل جیسے زمین کے اندر دھنس گیا تھا۔ وہ کبھی جمیلہ کو اور کبھی میز پر رکھے سفید تھیلے کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر تلاوت سُنتا رہا پھر دونوں ہاتھ فرش پر ٹِکا کر وہ ان کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میز کی طرف قدم بڑھائے، قریب پہنچ کر آنکھیں بند کیں۔ ہاتھ بڑھایا اور تھیلہ اٹھایا۔ وہ آنکھیں کھولے بغیر اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ باہر آ کر اس نے تھیلے کو کندھے پر رکھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا، وہ آج اپنے بیٹے کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے، جو اسے بہت بھاری معلوم ہو رہا تھا۔

............☆☆☆............

پناہ

شمس الدین شمیم کے نام

"کہانی پڑھی میں نے۔اچھی کہانی ہے۔بہت خوب۔ شاباش، لکھتے رہو۔میں نے جاوید آذر سے بھی بات کی۔اور باقی سب ٹھیک۔دعا کرنا۔خدا حافظ"۔کہانی چھپنے کے بعد شمیم کا فون اکثر رات دیر سے آتا اور وہ یہ سیدھے سادھے دل میں اُترنے والے چند جملے کہہ کر فون رکھ دیتا۔میں ان چند سیدھے سادھے جملوں کے دوش پہ سوار دیر تک خود کو آسمان میں اُڑتا ہوا محسوس کرتا......لیکن یقیناً اب ایسا نہیں ہوگا۔یہ کہانی چھپنے کے بعد اب شمیم کا فون نہیں آئے گا۔اب کی بار فون کی گھنٹی کبھی نہیں بجے گی۔لیکن اندر بیٹھا کوئی بار بار کہہ رہا ہے......"تم اطمینان رکھو۔بے لوث محبت،خلوص اور اپنائیت کوئی مادی شئے نہیں جسے موت فنا کر سکے۔شمیم انہی اوصاف کا جیتا جاگتا مجسمہ تھا۔اس کے خلوص،بے لوث محبت اور اپنائیت کی گھنٹیاں ہمیشہ دلوں میں بجتی رہیں گی"۔

"عالم میں تجھ سے لاکھ سہی......تو مگر کہاں"

OOO

مزارِ شہدا کے عقب میں واقع گنجان محلے کی ایک تنگ اور تاریک گلی سے نکل کر جونہی حلیمہ زینب اور آصف کو لے کر ایک دوسری قدرے چوڑی گلی "شہید گلی" کے نکڑ پر پہنچی تو

دائیں طرف، جہاں سے مزار شہدا کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا، ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی۔ زینب اور آصف پہلے ایک دوسرے کی طرف پھر بڑی معصومیت سے ماں کی جانب دیکھنے لگے۔ گلی میں دوسرے آنے جانے والے، جن میں سکولی بچے بھی تھے، حلیمہ کو اس طرح نکڑ پر کھڑی دیکھ کر خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ جنہیں دیکھ کر زینب قدرے اُکتائے ماں کے ہاتھ کو جھٹکتا دیتے ہوئے بولی۔ ''امی، سکول دیر ہو رہی ہے۔ چلو نا اب''۔ حلیمہ نے بچوں کی طرف دیکھا۔ ایک سرد آہ بھری اور بچوں کے ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی۔ بڑی سڑک پار کرنے سے پہلے پھر مڑ کر دیکھا۔ شہید گلی کے نکڑ کے بائیں طرف اب اُسے صرف مزارِ شُہدا کا ایک مختصر سا حصہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اپنا آپ اندر سے آج کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بچوں کی طرف دیکھ کر خود کو پھر اندر سے سمیٹا اور سڑک پار کر کے ایک گلی میں داخل ہوئی۔

بارہ سال پہلے حلیمہ کی شادی کے تیسرے سال اچانک ایک رات فورسز کی ایک بھاری جمعیت نے مشتاق احمد کے گھر کے آس پاس سارے علاقے کو محاصرے میں لیا۔ جس کے ساتھ ہی سارا علاقہ گولیوں کی گھن گرج سے لرز اُٹھا۔ مشتاق اور حلیمہ زینب اور آصف کے لے کر سیڑھیوں کے نیچے دُبک گئے۔ گولیوں کی گھن گرج کچھ کم ہوتے ہی آس پاس کے کسی مکان میں ایک زبردست دھماکہ ہوا جس کے ساتھ ہی موت کی سی خاموشی چھا گئی، جس میں اُنہیں اپنا گھر نیچے گہرائیوں میں دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ البتہ پہلے دھماکے کے بعد جو سناٹا اور خوف اُن پر طاری ہُوا وہ بھی کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ اُنہیں محسوس ہوا جیسے کسی کے حلق پر کوئی وزنی چیز رکھ دی گئی ہو اور وہ بچاؤ کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ حلیمہ کو نیچے سے فرش ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں کھولیں۔ باہر کا اندھیرا اندر کے اندھیرے سے زیادہ گہرا

محسوس ہوا۔ آنکھیں بند کرنی چاہیں۔ مشتاق نے نیم مردہ آواز میں پوچھا۔ ''کون ہوسکتا ہے؟ سنتے ہی حلیمہ کے سامنے اندھیرے میں بہت سے چہرے ایک ساتھ گھوم گئے۔ پھر ایک چہرے پر جیسے نظریں تھم سی گئیں۔ ''شاید عشہ دید ہے''۔ نام سنتے ہی جیسے کوئی مشتاق کے جگر کو دو ٹکڑے کر گیا۔ ''میں دیکھ آؤں عشہ دید کو''۔ شاید محاصرہ اُٹھ چکا ہے۔ ''نہیں'' کہتے ہوئے حلیمہ نے اُس کو روکنے کے انداز میں اندھیرے میں دور تک ہاتھ پھیلایا۔ ''ابھی محاصرہ نہیں اُٹھا''۔ مشتاق نے حلیمہ کا سرد ہاتھ چھوتے ہی چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی دل کو چیرتی ہوئی ایک اور چیخ سے دونوں لرز اٹھے۔ دونوں کے سامنے کئی ہمسایوں کے خون میں لت پت چہرے گھوم گئے۔ ''میں دیکھ کے آتا ہوں'' مشتاق کا لہجہ حتمی تھا۔ ''ابھی تھوڑی دیر ٹھہرو۔ اگر وہ اندر آئے...... میں اکیلی...... بچوں کو...... حلیمہ کی آواز رندھ سی گئی۔ ''نہیں وہ جا چکے ہیں۔ شاید میں کسی کی کچھ مدد کر سکوں۔ تم بچوں کے ساتھ یہیں بیٹھی رہو''۔ کہتے ہوئے مشتاق نے آصف کو دونوں بازوؤں میں اُٹھا کر اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے حلیمہ کے پاس ایک طرف زینب کے ساتھ لٹا دیا۔ ''میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ان کا کچھ بھروسہ نہیں۔ ابھی محاصرہ بھی نہیں اُٹھا۔ کوئی بلانے آئے تب نکلنا۔ تھوڑا انتظار کرو۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا''۔ حلیمہ کچھ اور کہنا چاہ ہی رہی تھی کہ بائیں طرف کسی مکان کے اندر کے کمرے کی چھت یا دیوار زور سے گرنے کی آواز کے ساتھ ساتھ جیسے وہ دونوں اس کے نیچے آگئے۔ سناٹا اور گہرا ہوگیا۔ زینب اور آصف نے خوف اور نیند کے درمیان جھولتے ہوئے ماں کے گرد اپنی گرفت اور مضبوط کر لی۔ مشتاق کو اپنا آپ کسی گہرے کنویں میں گرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ''اب کیا ہوگا''؟ حلیمہ کی مریل سی خشک آواز نے مشتاق کو جیسے گرتے گرتے تھام لیا۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا' تم صبر سے کام لو''۔ مشتاق کی آواز اُسے کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ آس پاس سے پھر گھٹی گھٹی چیخوں کی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔''میں جا کر جلدی جلدی ایک نظر دیکھ کے آتا ہوں۔ مجھ سے یہاں بیٹھا نہیں جاتا''۔ کہتے ہوئے مشتاق اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔''نہیں! میرا دل گھبرارہا ہے۔ صبح ہونے دو۔ ان حالات میں تم کیا کر سکتے ہو''۔ حلیمہ کے لہجے میں بے بسی کے باوجود مشتاق کو اُس کی آواز چیخ ہی معلوم ہوئی۔''مجھے نہیں معلوم، لیکن مجھ سے یہاں بیٹھ کر رہا نہیں جاتا۔ تم اطمینان رکھو، اللہ سب ٹھیک کرے گا''۔ کہتے ہوئے مشتاق اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا دروازے کی جانب نکل پڑا۔ حلیمہ نے آنکھیں بند کیئے بچوں کو زور سے اپنے قریب کرلیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ چند لمحے سکوت چھایا رہا۔ پھر گولیوں کی گھن گرج سے سارا ماحول لرز اُٹھا۔ محاصرہ ابھی نہیں اُٹھا تھا۔

دوسرے دن صبح مزارِشہدا میں پانچ لاشیں دفن ہوئیں۔ جن میں ایک مشتاق کی تھی۔ گنجان محلے کی اس چوڑی ''شہید گلی'' کی دائیں طرف سے مزارِشہدا کی تقریباً تین فٹ اونچی لوہے کی جالی سے اندر دور تک قبریں نظر آتی تھیں۔ سات آٹھ مہینے کے بعد جب حلیمہ کچھ سنبھلی۔ بچوں کی حالت دیکھ کر اس کی مردہ زندگی میں کچھ حرکت ہوئی۔ جینے کے لئے نئے نئے خواب بُننا شروع کئے۔ وہ اسی چوڑی ''شہید گلی'' سے گزرتے ہوئے تین فٹ اونچی جالی سے جھانک کر مشتاق کی قبر کو ٹکٹکی باندھے دیر تک دیکھتی رہتی۔ منہ سے کچھ بولتی نہیں تھی۔ تاہم اندر ہی اندر جیسے بار بار دوہراتی ''ابھی ٹھہرو۔ صبح ہونے دو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے''۔ پھر جیسے جواب کے انتظار میں وہیں کھڑی رہتی' یہاں تک کہ آس پاس کی چند عورتیں

اور بزرگ آ کر اُسے دلاسہ دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتے۔

حلیمہ کا مائیکہ مزارِ شہدا کی دوسری طرف بڑی سڑک کے پار ایک دوسرے محلے میں تھا۔ اس کے دو بھائی تھے جو اکثر شام کو آ کر زینب اور آصف کے ساتھ ساتھ بہن کی سُونی زندگی میں پھر سے رنگ بھرنے کی کوشش کرتے۔ کچھ عرصہ بعد بچوں کے ساتھ ساتھ حلیمہ پر بھی اس کا اچھا خاصا اثر ہوا۔ گو کہ اس دوران مزارِ شہدا بڑی سڑک کے چوراہے تک پھیل گیا تھا۔ اس صورتِ حال سے بے خبر حلیمہ زینب اور آصف نئے سرے سے زندگی کو جوڑنے میں محو تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں خورشید نے حلیمہ سے بات کر کے دونوں بچوں کا اپنے محلے کے ایک انگلش میڈیم سکول میں داخلہ کروایا۔ جس سے حلیمہ کی زندگی میں اور ٹھہراؤ آ گیا۔ وہ روز صبح سویرے بچوں کو تیار کرتی۔ اُنہیں سکول چھوڑنے جاتی اور 'شہید گلی' سے گزرتے ہوئے ایک جگہ جالی سے جھانک کر مشتاق کی قبر کو ایک نظر دیکھ لینا اُس کا معمول بن گیا۔ زینب اور آصف ماں کی اس حرکت پر تذبذب میں رہتے۔ ایک دوسرے سے اس بارے میں بات بھی کرتے لیکن کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ ایک دن شام کو باتوں باتوں میں زینب نے پوچھ ہی لیا۔ ''امی تم نل کے پاس جالی کے اندر جھانک کر کس کو دیکھتی ہو؟'' سُنتے ہی حلیمہ کا کلیجہ مُنہ کو آیا۔ جی میں آیا سینے میں کھولتے آتش فشاں کو اُگل دے۔ پھر ضبط کر کے ٹال دیا۔ رات بھر روتی رہی۔ سویرے بچوں کو ایک دوسری گلی سے سکول چھوڑنے گئی۔ اس گلی سے مشتاق کی قبر تو نہیں البتہ مزارِ شہدا کا ایک تھوڑا سا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ زینب جو آصف سے ایک سال بڑی تھی اس تبدیلی سے اور تذبذب میں پڑ گئی۔ ایک دن باتوں باتوں میں ماموں سے پوچھ بیٹھی۔ ''ماموں آپ کو پتہ ہے، امی باہر گلی میں نل کے

پاس جالی سے جھانک کر کیوں دیکھتی تھیں۔ ہمیں اکثر سکول دیر ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے پو چھا بھی۔ کچھ نہیں بولی۔ بس تب سے ہمیں سکول چھوڑنے کے لئے اب دوسری گلی سے جاتی ہیں۔ کیوں؟ خورشید چند لمحے زینب کو دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے''۔ پھر کچھ دن بعد خورشید زینب اور آصف کو مشتاق کی قبر پر لے گیا۔ زندگی، موت اور شہادت کے متعلق بہت ساری باتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکے۔ بس یہ کیا کہ شہید گلی میں کھیلنے کے بعد باپ کی قبر کی صفائی کرتے۔ جاتے جاتے باپ کی قبر کی پیشانی چوم لیتے جس سے ان کی ساری گتھیاں سلجھ جاتی تھیں اور وہ مطمئن ہو کر گھر لوٹتے۔

سکول پہنچ کر گیٹ پر حلیمہ زینب اور آصف کو دوسرے بچوں کے ساتھ سکول کے احاطے میں داخل ہوتے ہوئے دیر تک دیکھتی رہی۔ جب واپس مڑی جی پھر کچھ بھاری سا محسوس ہوا کچھ بے چین سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی پھر اچانک میکے کا خیال آیا۔ کئی دنوں سے وہاں گئی نہیں تھی۔ قدرے اطمینان محسوس کرتے ہوئے دوسری گلی میں مڑ گئی۔ ایک آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھی رہی۔ وہاں سے نکل کر جب باہر آئی، وہی کیفیت پھر طاری ہوئی۔ پھر فوراً خیال آیا۔ کئی دنوں سے بلڈ پریشر کی دوا نہیں لی ہے۔ شاید اس وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ سوچتے ہوئے گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ تھوڑی دور چل کر بڑی سڑک کراس کی اور ایک تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے قدرے سنبھل گئی تھی۔ تاہم ہلکا ہلکا بوجھ اب بھی محسوس کر رہی تھی۔ اُسے عجیب طرح کا خوف گھیرے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔ خود کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس دوران دور سے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی۔ وہ کھڑکی کے قریب آئی۔ اتنے میں دوسرا دھماکہ ہوا۔ پھر ایک ساتھ کئی

دھماکے ہوئے۔ وہ بت بنی چند لمحے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اچانک زینب اور آصف یاد آتے ہی دروازے کی طرف بھاگی۔ اتنی دیر میں ہر طرف کہرام مچ گیا تھا۔ باہر گلی میں لوگ بچے، بوڑھے، عورتیں سب جائے پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں ننگے سر کسی طرح گلی سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ اس دوران سارا علاقہ محاصرہ میں لیا گیا تھا۔ اُس نے کسی طرح سڑک پار کی اور گلیوں سے ہوتے ہوتے سکول پہنچ گئی۔ سکول ویران پڑا تھا۔ دائیں بائیں آنے جانے والوں سے پوچھنے لگی ہمسایوں کے گھر گئی۔ ایک دو بچوں کے گھر بھی گئی۔ لیکن بچوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ میکے کا خیال آیا، شاید بچے وہاں گئے ہوں۔ محاصرہ توڑتے ہوئے کسی طرح وہاں پہنچی۔ بچے وہاں بھی نہیں تھے۔ میکے والوں نے بہت دلاسہ دیا۔ تھوڑی دیر دم سنبھالنے کو کہا۔ لیکن وہ ''میرے بچے۔ میرے بچے'' کہتی ہوئی پھر گلیوں میں پاگلوں کی طرح زینب اور آصف کا نام لے لے کر چلانے لگی۔ پوری طرح نڈھال ہو کر ایک گلی کے نکڑ پر ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ پھر اچانک اندر سے ایک موہوم سی اُمید جاگی۔ ''ممکن ہے بچے گھر پہنچ گئے ہوں''۔ سوچتے ہی جیسے مردہ جسم میں جان سی آ گئی۔ دائیں بائیں دیکھا گلی سنسان تھی۔ شاید سب لوگوں کو جائے پناہ مل چکی تھی۔ وہ پوری ہمت سے اُٹھی اور پورے عزم اور اعتماد کے ساتھ مڑ کر ایک گلی میں داخل ہوئی۔ اس دوران کرفیو سخت ہو گیا تھا۔ لیکن کسی طرح وہ گلیوں میں خود کو چھپتے چھپاتے بڑی سڑک پر آ گئی۔ سڑک پر دور تک ہُو کا عالم تھا۔ سڑک کے پار دیکھا۔ موہوم سی اُمید یقین میں بدل گئی۔ بچے ضرور گھر پہنچ گئے ہوں گے اور اب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سوچتے ہی آنکھیں تقریباً بند کرتے ہوئے گرتے پڑتے سڑک پار کی

اور پھولتی سانسوں پر قدرے قابو پاتے ہوئے آگے کی جانب دیکھا۔ سامنے مزارِ شہدا کا بیرونی دروازہ دیکھ کر پھر سانسیں تیز ہوئیں۔ آگے بڑھنا ہی چاہا تھا تو محسوس ہوا جیسے سامنے دروازے پر مشتاق زینب اور آصف کے ساتھ کھڑا اُسے اپنی جانب بلا رہا ہے۔ وہ عجیب تذبذب اور حیرت میں سب کچھ بھول کر اُس جانب دیکھتی رہی۔ پھر جیسے آپ ہی آپ مزارِ شہدا میں داخل ہوئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی جیسے ہوا کے ایک لطیف خوشگوار جھونکے نے اُس کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسی عالم میں دو چار قدم آگے بڑھی۔ سامنے قبروں کی جگہ دور تک بچوں، بزرگوں اور نو جوان کو ریشمی پوشاکیں پہنے ایک دوسرے سے محوِ گفتگو دیکھ کر اس پر غشی سی طاری ہوئی۔ آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی مشتاق پھر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کو دیکھتے دیکھتے خود کو پھر سنبھالا۔ قبروں کے درمیان سے احتیاط سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھی۔ اسے محسوس ہوا مشتاق کی قبر کو کسی نے جیسے دودھ سے نہلایا ہے۔ تھوڑا اور آگے بڑھی۔ قبر کے قریب پہنچ کر وہ بے یقینی اور عالم بے خودی میں نیچے بیٹھ گئی۔ سامنے مشتاق کی قبر کے ایک طرف زینب اور دوسری طرف آصف باپ کے سینے پر سر رکھ کر گہری نیند میں تھے۔ وہ زینب اور آصف کو دیکھتی رہی۔ پاس کی مسجد سے ظہر کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا، جو اذان مکمل ہونے تک جاری رہا۔ اذان پوری ہونے پر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ جوان، بزرگ، بچے سب جا چکے تھے۔ مزارِ شہدا پر عجیب خاموشی چھائی تھی۔ حلیمہ قریب ہی ایک قبر سے ٹیک لگائے زینب اور آصف کے نیند سے جاگنے کا انتظار کرنے کے لئے وہیں بیٹھ گئی۔

............☆☆☆............

آجادی

شہر میں جاری کرفیو کے ساتویں روز صبح سویرے کچھ حساس علاقوں میں فوج کی ٹکڑیوں میں مزید اضافہ کیا گیا۔ پندرہ افراد پر مشتمل ایک ٹکڑی میں شامل انسپکٹر سریندر کو دریش پُل پر تعینات کیا گیا۔ سریندر پچھلے ڈیڑھ سال سے متواتر شہر کے مختلف علاقوں میں رات دن اپنی ڈیوٹی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکا ہے۔ اپنی چار سال کی ننھی بچی کنول کا پھول سا چہرہ ہر وقت اُس کے ذہن میں گھومتا رہتا ہے۔ ایک مہینہ پہلے چھٹی کے لیے درخواست دی ہے، تب سے بھگوان سے درخواست منظور ہونے کی پرارتھنا کر رہا ہے۔
صبح گاڑی سے اترتے ہی من ہی من پراتھنا میں مگن تھا کہ اچانک آس پاس کی گلیوں، مکانوں، دکانوں سے دھوپ کا ایک بڑا ریلا کرفیو توڑ کر اس کے آگے دائیں بائیں دریش پُل کے آر پار دور تک پھیل گیا۔ چند لمحے وہ تذبذب میں مشکوک نظروں سے دھوپ کو دیکھتا رہا۔ پھر کچھ اطمینان ہوتے ہی ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پل کے اس سرے پر کھڑا تھا۔ دائیں بائیں مکان، دکانیں، سامنے سڑک، نیچے پانی کی سطح پر ٹھہرے ڈونگے...... سب

ساکت تھے۔ کسی میں کوئی حرکت نہ دیکھی۔ دریا کے کنارے پر کھلنے والی گلیوں کے دہانوں پر بیٹھے آوارہ کتے اپنی تھوتھنیاں اگلی ٹانگوں میں دبائے آس پاس کے ماحول کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ کرفیو پر سختی سے عمل ہو رہا ہے۔ یہ سوچتے ہی اسے اطمینان ہوا۔ اس دوران دوسرے ساتھی گشت پر نکلے تھے۔ اس نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لی اور دائیں بائیں نظریں دوڑاتا پل کی دوسری جانب بڑھنے لگا۔ ابھی چند ہی قدم بڑھائے کہ کہیں سے رونے کی آواز سن کر وہیں رک گیا۔ رونے کی آواز کہیں آس پاس سے ہی آ رہی تھی۔ غور سے دائیں بائیں دیکھا۔ اسے لگا آس پاس کے سارے مکان، دکانیں، سامنے سڑک، گلیاں، نیچے دریا اور ڈونگوں کے ساتھ ساتھ دریا کے کناروں پر کتے سب ایک ساتھ رو رہے ہیں۔ اسی اثنا میں پولیس کی ایک جیپسی پل پر سے تیزی سے گزر گئی جس کے شور میں اس کے محسوسات اور رونے کی آواز ایک ساتھ دب سے گئے۔ دوسرے ہی لمحے ماحول پھر پہلی والی حالت پر آ گیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا جس کے ساتھ ہی رونے کی آواز بھی بڑھنے لگی اور صاف سنائی دینے لگی۔ کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ تذبذب میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ سڑک پار کی اور دوسری جانب مکانوں کی طرف ٹھہر ٹھہر کر کان لگائے۔ مگر کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ واپس مڑ کر پھر سڑک پار کی اور غور سے رونے کی آواز سننے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اسے یقین ہو گیا کہ آواز پل کے نیچے سے آ رہی ہے۔ قدرے جھکتے ہوئے نیچے ڈونگوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسی طرح غور سے دیکھتا رہا۔ اس دوران ٹھیک سے اندازہ ہو گیا کہ رونے کی آواز پہلے ڈونگے سے آ رہی ہے۔ پھر اچانک کچھ یاد آتے ہی وہ مستعدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رائفل کو مضبوطی

سے پکڑا، دائیں بائیں دور تک نظریں دوڑائیں۔ کرفیو برابر سختی سے نافذ تھا۔ لیکن رونے کی آواز برابر اس کے کانوں کو چیرتی رہی۔ پھر مڑ کر نیچے ڈونگے کی طرف دیکھا۔ تذبذب میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''شاید بہت بیمار ہے'' اس نے کھڑے کھڑے ایک لمحے کے لئے سوچا......

''میں کیا کر سکتا ہوں'' خود سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے واپس مڑنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ ذہن میں کنول کا چہرہ گھوم گیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ حرکت میں آ گیا اور مڑ کر نیچے ڈونگے کی جانب پھر دیکھنے لگا۔ پھر سامنے گلی کی طرف جو سڑک سے اتر کر ڈونگے کے سامنے دریا کنارے پر کھلتی تھی، آگے بڑھا اور پل پار کرتے ہی دائیں طرف گلی میں مڑ گیا اور رونے کی آواز کے تعاقب میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چند ہی لمحوں میں ڈونگے کے سامنے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ رونے کی آواز قریب سے سننے پر اسے محسوس ہوا جیسے کنول کا رونا بھی اس میں شامل ہے۔ اس نے رائفل کو سیدھا کر کے ڈونگے کی کھڑکی پر زور سے ایک دو بار دستک دی۔ جس کے ساتھ ہی رونا بند ہو گیا اور ہلکی آواز کے ساتھ ہی کھڑکی کھلی۔ سامنے فوجی کو دیکھ کر قادر کی جیسے روح نکل گئی۔ اس کا گلا سوکھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ غش کھا کر گر پڑتا سریندر نے قدرے نرمی سے پوچھا ''بچہ کیوں رو رہا ہے، بیمار ہے''؟ ''نہیں! بیمار نہیں، بھوکا ہے۔ پرسوں سے کچھ کھایا نہیں، تھوڑے چاول تھے ختم ہو گئے''۔ اب...... قادر مشکل سے اتنا ہی کہہ پایا کہ بچے نے قادر کے کندے سے سر اٹھا کر سریندر کی طرف دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ شدت سے رونے لگا۔ اس بار رونے میں خوف کا عنصر زیادہ تھا۔ سریندر قادر کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ قدرے اونچی آواز

میں پوچھا۔ ''چاول کہاں سے ملیں گے''۔ ''اوپر محی الدین کی دکان سے لیکن میرے پاس''......اتنا کہتے ہوئے قادر کا ہاتھ اوپر اٹھتے ہوئے جیسے وہیں ساکت ہو گیا۔ سریندر نے اوپر کی جانب دیکھا۔ پھر قادر کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بات نہیں، آؤ میرے ساتھ'' کہتے ہوئے سریندر نے سامنے والی گلی کا رخ کیا۔ قادر نے کھڑکی بند کر دی۔ پیچھے کھڑی بیوی کو کچھ سمجھایا اور بچے کو گود میں لے کر سامنے والے دروازے سے نکل کر ڈونگے اور کنارے کے درمیان ٹکائے بارہ انچ چوڑے دیودار کے پھٹے پر ڈولتا ہوا کنارے پر آ گیا۔ بچہ زور زور سے رو رہا تھا۔ اس کے رونے میں اب بھی خوف کا عنصر غالب تھا۔ وہ گلی کے سامنے پہنچ گیا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے گلی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ہانپتے ہوئے گلی میں گھس گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ سڑک پر سریندر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''کہاں ہے اس کی دکان''۔ سریندر نے دائیں بائیں دکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ قادر نے پھولتی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دائیں طرف چند دکانیں چھوڑ کر ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ''وہ...... وہ سرخ شرٹ والی...... وہ...... محی الدین کی ہے'' سریندر نے محی الدین کی دکان کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر مڑ کر قادر سے پوچھا ''ٹھیک ہے''۔ ''لیکن یہ رہتا کہاں ہے''۔ اس کا گھر بھی دکان کے ساتھ ہی ہے۔ قادر نے بلکتے بچے کو ایک کندھے سے اٹھا کر دوسرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا آؤ میرے ساتھ''۔ کہتے ہوئے سریندر دکان کی جانب بڑھنے لگا اور قادر پیچھے پیچھے......قریب پہنچ کر سریندر نے اوپر سے نیچے تک پورے مکان اور دکان کا جائزہ لیا۔ پھر آگے بڑھ کر گلی میں کھلنے والے مکان کے دروازے پر ہاتھ سے دو تین بار دستک دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک

ادھیڑ عمر کا آدمی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ''تمہارا نام محی الدین ہے'' سریندر نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ ''جی جی جی''۔ مشکل سے محی الدین نے جواب دیا۔ ''دکان میں چاول سبزی کچھ ہے''۔ سریندر نے پہلے والے لہجے میں پوچھا...... محی الدین نے یہ سُن کر اندر ہی اندر راحت کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چاول اور پیاز ہے''۔ ''ٹھیک ہے اس آدمی کو تھوڑا چاول اور پیاز دو۔ پیسے بعد میں دے گا، بچہ بھوکا ہے''۔ سریندر نے قادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ محی الدین نے ایک نظر قادر اور روتے ہوئے بچے پر ڈالی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے چابی لاتا ہوں'' کہتے ہوئے واپس مڑا۔ سریندر دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ قادر پورے یقین کے ساتھ بچے کو تسلیاں دینے لگا۔ اس دوران محی الدین نے چابی لے کر دوکان کے تالے کھولے۔ شٹر کُھلنے کی آواز کے ساتھ ہی جیسے آس پاس کا سب کچھ حرکت میں آ گیا۔ سریندر خود بھی ہڑ بڑا گیا۔ رائفل کو ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران سب کچھ پھر پہلی حالت پر آ گیا تھا ''کرفیو پر سختی سے عمل ہو رہا ہے'' سوچتے ہوئے اس نے کھلی ہوئی دکان کی طرف دیکھا۔ اس دوران محی الدین ایک تھیلے میں چاول بھر چکا تھا۔ قادر بے یقینی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اچانک روتے روتے بچے کی نظر دکان میں آویزاں مختلف چپس پیکٹوں کے ساتھ ساتھ دوسری قسم قسم کی مٹھائیوں، چاکلیٹ وغیرہ پر پڑتے ہی وہ اور زور زور سے رونے لگا اور لپک لپک کر اُن کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ قادر اسے تسلیاں دے کر ایک کندھے سے اٹھا کر دوسرے کندھے پر رکھ کر تھپکیاں دے کر خاموش کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ سریندر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر محی الدین کے ہاتھ

میں تھما دیا اور سامنے سے ایک چپس کا پیکٹ اٹھا کر بچے کے قریب آ گیا اور چپس کا پیکٹ بچے کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو، اب تو چپ ہو جاؤ......' چپس کا پیکٹ لے کر بچہ فوراً چپ ہو گیا۔ سریندر بچے کو خاموشی سے دیکھتا رہا پھر قدرے اطمینان سے پوچھا۔ ''شاباش......اب بولو اور کیا چاہیے'' بچے نے چپس کے پیکٹ سے کھیلتے ہوئے اسی اطمینان سے جواب دیا...... ''آجادی''......!

............☆☆☆............

جواب دو

وہ سب دو دو تین تین ٹولیوں کی شکل میں سر جھکائے ہاتھوں میں پلے کارڈ اُٹھائے خاموشی سے شہر کے وسط میں بنے پارک کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں پر وہ ہر مہینے کی دس تاریخ کو جمع ہو کر پچھلے کئی برسوں سے احتجاج کرتے آ رہے ہیں۔ شہر کے وسط میں دو معروف ترین بازاروں کے درمیان واقع یہ پارک اپنی خوبصورتی اور رومان پرور ماحول کی وجہ سے خاص کر گرمیوں میں اکثر لوگوں کے لئے کچھ زیادہ ہی کشش رکھتا ہے۔ جس کے ایک سرے پر چوک کی جانب بڑے چنار کے قریب پارک کے خوبصورت لوہے کے جنگلے کے تقریباً تین فٹ اندر ایک اونچی اور چوڑی ہورڈنگ ایستادہ کی گئی تھی، جس پر پسِ منظر میں وادی کے خوبصورت کوہساروں، آبشاروں جھیلوں، جھرنوں کو اس کمال مہارت سے اُتارا گیا تھا کہ قریب ہی سڑک سے تقریباً ہر گزرنے والا ایک نظر دیکھنے کے بعد بار بار مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ اس دوران وہ پارک میں داخل ہو کر چوک کی جانب والے سرے کے قریب بڑے چنار کی چھاؤں میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ خدیجہ بھی ہاتھ میں پلے

کارڈ لیے تھکی تھکی نظروں سے اُدھر دیکھنے لگی۔ چنار کی چھاؤں اُسے گہرا کالا دُھواں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چھاؤں سے ہٹ کر قریب ہی ایستادہ ہورڈنگ کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوتے ہی وہ ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے اپنے پلے کارڈ اوپر آسمان کی جانب پوری قوت سے اُچھال اُچھال کر احتجاج کرنے لگے۔ اُنہیں دیکھ کر سڑک سے گزرنے والوں کے قدم جیسے تھم سے گئے۔ وہ اُنہیں بے بسی اور لاچاری سے دیکھتے رہے۔ احتجاج جاری تھا۔ خدیجہ نے لوگوں کی طرف دیکھا...... اندر سے کچھ ہمت سی بندھی...... وہ آہستہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتے ہاتھوں سے اپنا پلے کارڈ پوری قوت سے آسمان کی طرف بلند کیا...... سڑک پر جمی بھاری بھیڑ نے دیکھا۔ ایستادہ ہورڈنگ پر پیشِ منظر میں بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

''اگر فردوس بروئے زمین است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اس شعر کے ٹھیک نیچے خدیجہ کے پلے کارڈ پر لکھا تھا۔ ''میرا فردوس کہاں ہے۔؟''

............☆☆☆............

دردکا دریا

فجر کی اذان کے ساتھ ہی راجیش نے کروٹ بدلی۔طویل سافت کے بعد اتنی گہری اور میٹھی نیند اُسے ایک مدت بعد نصیب ہوئی تھی۔آنکھیں بند کئے ہوئے ایک ہاتھ سے ہلکی رضائی سر کے اوپر تک کھینچ لی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا۔سونے کی بہت کوشش کی لیکن میٹھی نیند ایک سپنا ہی رہی۔ساتھ ہی باہر سے پرندوں کی چہچہاہٹ اُسے گھیرے میں لیتے ہوئے محسوس ہوئی۔ چند لمحے وہ اس چہچہاہٹ سے اندر ہی اندر جھومتا رہا۔ پھر سر سے رضائی سرکائی۔آنکھیں کھولنا ہی چاہیں کہ سامنے اَدھ کھلی کھڑکی سے ہوا کا ایک تازہ سرد جھونکا آ کر اس کے چہرے کو چھو کر گزر گیا جس کی ٹھنڈک سے سارے جسم میں ہلکی جھرجھری سی ہوئی۔جس نے اُسے پوری طرح بیدار کیا۔ پھر آنکھیں بند کیں اور لیٹے لیٹے سوچنے لگا۔ آج وہ ایک مدت کے بعد اتنی میٹھی اور گہری نیند سویا ہے اور صبح ہوا کے لطیف جھونکوں نے اُس کا استقبال کیا۔ساتھ ہی اندر ہی اندر ذہن پر زور دینے لگا کہ آج وہ کتنے برس بعد پھر اس سورگ میں لوٹ آیا ہے ''شاید دس سال بعد...... نہیں شاید بیس سال بعد۔نہیں

شاید......" وہ اندر ہی اندر سالوں کے حساب میں اُلجھ کے رہ گیا......"اب تو آ ہی گیا ہوں۔ چاہے دس سال بعد یا بیس سال بعد۔اب پھر وہی مستیاں ہونگیں۔اب پھر ہر شام جھیل کنارے گزرے گی۔اندر ہی اندر سوچتے ہوئے قدرے مطمئن ہو کر علی محمد اور اُس کے گھر والوں کے ساتھ گزرے خوبصورت واقعات کو یاد کرنے لگا۔

تقریباً بیس برس قبل دلی میں ایک صنعتی نمائش میں کشمیری دستکاری کی کچھ خاص چیزوں کی تلاش کے دوران راجیش کی ملاقات علی محمد سے ہوئی تھی......علی محمد کے سٹال میں رکھی کشمیری دستکاری سے متعلق کچھ چیزیں راجیش کو پسند آئی تھیں اور علی محمد نے بھی ان چیزوں کو راجیش کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کیا تھا کہ راجیش نے چیزوں کے ساتھ ساتھ علی محمد کی زبان اور سادگی سے متاثر ہو کر اور بھی بہت ساری چیزیں خریدی تھیں۔دو مہینے تک جاری نمائش کے دوران راجیش وہاں آ کر علی محمد سے کشمیر سے متعلق اور باتوں کے علاوہ کشمیری دستکاری کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا......اور علی محمد پوری تفصیل سے اپنی دستکاریوں کے متعلق بتاتا رہا۔ان ملاقاتوں کا سلسلہ نمائش کے ختم ہونے تک چلتا رہا۔آخر جب نمائش ختم ہونے کے بعد سب اپنے اپنے سٹال بند کر کے گھروں کا رخ کرنے لگے تو راجیش نے علی محمد کو چند دِن اس کے یہاں ٹھہرنے پر راضی کر لیا تھا اور علی محمد کی تقریباً ایک ہفتہ راجیش کے گھر میں بہت آؤ بھگت ہوئی تھی۔اس دوران علی محمد کی سادگی اور شرافت نے راجیش کا دل موہ لیا۔کاروباری تعلقات اور عمر کے تفاوت پر دوستی غالب آ گئی......ایک ہفتہ بعد جب علی محمد نے گھر جانے کا فیصلہ کیا تو راجیش کو اگلے سال گرمیوں میں سرینگر آنے کی دعوت دی تھی۔جسے راجیش نے کُھلے دل سے مسکراتے ہوئے

قبول کیا تھا۔ پھر اگلے سال جولائی کے مہینے میں راجیش پہلی بار سرینگر پہنچا تو علی محمد نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا تھا۔ تقریباً دو ہفتے علی محمد کا مہمان رہنے کے دوران راجیش نے جی بھر کر وادی کی سیر کی۔ دو دن کے لئے جاوید کو ساتھ لے کر پہلگام جانے کا شوق بھی پورا کیا۔ باقی دن گھوم پھر کر شام کو جھیل کنارے دیر تک ٹہلنے نکل جاتے۔ واپسی پر علی محمد کا گھر قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ خاص کر مُنّی اور صیف کی شرارتیں اُنہیں دیر تک جگائے رکھتیں۔ اس دوران اگر جاوید اُنہیں ڈانٹتا تو دونوں دوڑ کر راجیش کی گود میں پناہ لیتے اور یہ سب دیکھ کر علی محمد اندر ہی اندر خوشی سے پھولے نہیں سماتا...... دو ہفتے بعد جب وہ راجیش کو ائیرپورٹ سے رخصت کر کے گھر لوٹے تو کئی دنوں تک انہیں راجیش کی کمی بڑی شدت سے ستاتی رہی۔ اگلے چند مہینوں میں علی محمد نے اپنے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لئے زبردست تگ و دو شروع کی جس میں اُسے جلدی ہی کامیابی بھی ملی اور پہلی بار راجیش کا ہر مہینے کوئی نہ کوئی آڈر وقت پر پورا کر کے بھیجتا رہا...... اُس کا ایکسپورٹر بننے کا خواب پورا ہوتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ اسی دوران مُنّی کو بسکو سکول میں داخلہ ملا...... صیف پاس ہی لال چوک میں ایک English Medium سکول میں چوتھی جماعت پاس کر کے پانچویں میں آ گیا...... دوسرے سال جب جاوید نے میٹرک میں اپنے اسکول میں اول پوزیشن حاصل کی تو راجیش یہ خبر ملتے ہی سرینگر آ کر اُنہیں اپنے ساتھ دلی لے گیا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے وہ اُنہیں پوری دلی کی خوب سیر کراتا رہا...... اکثر مُنّی کو گود میں اُٹھاتا اور صیف کی اُنگلی پکڑ کر آگے آگے چلتا۔ علی محمد اور جاوید اُنہیں دیکھتے رہتے...... واپس آ کر علی محمد نے کاروبار میں راجیش کے کہنے پر اور جان لگا دی۔ اُسے اپنا خواب پورا ہونے کے قریب محسوس ہو رہا تھا،

کہ اچانک وقت نے ایسی کروٹ لی کہ جو جہاں تھا وہ وہیں جیسے زمین میں گڑ گیا۔ جیسے فرد فرد کے درمیان میلوں لمبی شیشے کی موٹی دیوار تن گئی۔ سب کچھ ٹوٹنے کے ساتھ دوسرے تمام رابطے بھی کٹ کر رہ گئے...... بڑی مشکلوں کے بعد راجیش کا علی محمد سے رابطہ ہوا تھا۔ لیکن کوشش کے باوجود بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں پائے تھے۔ پھر بھی راجیش کسی بھی صورت میں علی محمد سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود وہ ناکام رہا۔ فرد فرد کے درمیان میلوں لمبی شیشے کی موٹی دیوار اور موٹی اور سخت ہوتی گئی۔ جس سے دوریاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ پیار، محبت، خلوص، رشتے سب ایک خواب سا لگنے لگے۔ اسی دوران کچھ عرصہ بعد راجیش کو ایک نمائش میں شرکت کے لئے بیرونِ ملک جانا پڑا جہاں نمائش کے دوران اُس کی ملاقات ایک خوبصورت یورپی لڑکی سے ہوئی۔ دو ایک ملاقاتوں کے بعد دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں۔ دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ نئے ساتھی کو ساتھ لے کر راجیش بزنس کو چاند تک لے جانے کی دُھن میں مگن رہا...... کہ ایک دن پتاجی کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملتے ہی وہ بیوی اور ننھی گڈی کے ساتھ پانچ سال بعد واپس ہندوستان لوٹ آیا...... گھر پہنچنے کے چند دن بعد پتاجی سورگ باش ہو گئے۔ پھر کچھ دن ٹھہرنے کے بعد واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ایک دن شام کو ٹی وی سے سرینگر سے متعلق ایک دستاویزی فلم کے ایک منظر نے اُسے چونکا دیا۔ وہ پوری فلم بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ جسے دیکھ کر اُسے محسوس ہوا کہ واقعی سرینگر کے حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ زندگی پھر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ لوٹ آئی ہے۔ سوچتے ہی آنکھوں کے سامنے علی محمد، مُنی، سیف اور جاوید مسکراتے ہوئے مختلف

زاویوں میں رقص کرنے لگے۔ صبح وہ مختلف پرانے اخبار میگزین وغیرہ اکٹھا کر کے کشمیر سے متعلق خبریں، مضمون وغیرہ پڑھتا رہا۔ جنہیں پڑھ کر اُسے پورا اطمینان ہوا کہ اب واقعی کشمیر میں حالات بہتر ہو گئے ہیں...... ''مجھے فوراً علی محمد سے رابطہ کرنا چاہیئے''۔ مشکل سے ایک نمبر حاصل کیا...... ''وہ علی محمد کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بہت شرمندہ ہے۔ اتنے سال تک ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے رابطہ نہیں کر سکا۔ لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا اب وہاں حالات بالکل ٹھیک ہیں...... تمام رابطے پھر سے استوار ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف کا راستہ بھی کھل گیا ہے...... لیکن کوشش کے باوجود بھی رابطہ نہیں ہو پایا...... اُس رات راجیش دیر تک علی محمد اور اُس کے بچوں کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر اچانک خیال آیا۔ ''کیوں نہ اتنے سالوں بعد ایک Surprise دوں۔ پہلے کی طرح رات بارہ ایک بجے دروازے پر دستک دوں اور علی محمد، جاوید، سیف اور مُنی کو اپنے سامنے پاؤں...... کتنے خوش ہوں گے...... نہیں...... نہیں۔ اب تو بچے بڑے ہو گئے ہوں گے...... علی محمد وہ تو شاید ایکسپورٹر بن گیا ہوگا بہت محنت کی ہے اس نے...... خیر ملتے ہی سب پتہ چل جائے گا...... پندرہ دنوں کا پروگرام بناؤں گا...... بائی ایئر جاؤں گا۔ نہیں...... نہیں جموں میں ایک پارٹی سے بھی ملنا ہے۔ بچوں کے لئے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے...... سوچتے ہی وہ صوفے پر وہیں لیٹ گیا۔

ہوا کے ایک اور تیز جھونکے سے ادھ کھلی کھڑکی کا پٹ کھٹکنے سے راجیش کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ قدرے بڑبڑا کر آنکھیں کھول کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کھڑکی سے سفید نرم دھوپ بیڈ شیٹ تک چڑھ آئی تھی۔ وہ بیڈ شیٹ پر دھوپ کو دیکھتا رہا اور کان دروازے کی طرف کہ ابھی دروازہ کھلے گا...... مُنی، صیف جاوید کوئی دروازہ کھولے گا۔ وہ

رات کو ایک بجے پہنچا تھا۔ دستک دینے پر علی محمد نے دروازہ کھولا تھا۔ تھکان کی وجہ سے صرف چند رسمی باتیں ہوئیں تھیں۔ اُسے یاد آیا...... ''علی محمد کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ مشکل سے ہی پہچانا تھا...... مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے مجھے ٹھیک سے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا...... کیا میری صورت اتنی بدل گئی ہے...... ہوسکتا ہے۔ بہت عرصہ ہوا...... لیکن ابھی تک کوئی کمرے میں آیا کیوں نہیں...... پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا......'' دھوپ سے نظریں ہٹا کر اُس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔ علی محمد چپ چاپ اندر آیا۔ راجیش کچھ گرمجوشی دکھاتے ہوئے اس کے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگا...... ''علی محمد کیا بات ہے بچے کہاں ہیں، کیسے ہیں، کہیں گئے ہیں کیا؟......'' ''ہاں ہاں'' علی محمد کے منہ سے آپ ہی آپ نکل گیا۔ ''کہاں، مجھے لے چلو وہاں۔ میں ان کے لئے بہت ساری چیزیں لایا ہوں۔ میں پانچ چھ سال امریکہ میں رہا۔ میں نے وہاں شادی بھی کی۔ میری ایک بچی ہے۔'' میں پہلے منی سے ملوں گا'۔ راجیش نے قدرے جذباتی ہو کر کہا...... ''ٹھیک ہے، تم تیار ہو جاؤ۔ ابھی چلتے ہیں'' علی محمد جیسے اپنے آپ سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ راجیش عجیب تذبذب میں کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے اسے بیڈ شیٹ پر دھوپ کا رنگ کچھ زرد سا پڑتا دکھائی دیا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب لالچوک سے ذرا دور ایک جگہ میٹا ڈار رُک گیا۔ علی محمد پہلے اُترا اور راجیش کی طرف دیکھے بغیر لال چوک کی طرف مڑ گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اسے رسیوں سے باندھ کر گھسیٹ کر لے جا رہا ہو۔ راجیش اس کی اس حالت سے بے خبر بازار میں دائیں بائیں گہما گہمی، چہل پہل، سیاحوں کی ٹولیاں دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

آگے دائیں بائیں نئی طرز کی دکانیں، شاندار اونچے اونچے شاپنگ کمپلیکس دیکھ کر اسے پورا یقین ہو گیا اب یہاں حالات بہتر ہیں۔ لال چوک کے وسط میں پہنچ کر علی محمد ایک جگہ جیسے گڑ گیا۔ راجیش جو چند قدم دور تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھا...... ''کیا بات ہے، علی محمد کیوں رک گئے، کیا کسی سے ملنا ہے''۔...... ''ہاں'' علی محمد پیچھے کی طرف مڑ گیا۔ راجیش نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے فوراً یاد آیا ''یہ تو بسکو سکول کا گیٹ ہے۔ یہاں مُنی پڑھتی تھی...... کیا وہ اب یہاں ٹیچر ہے'' کہتے ہوئے وہ جیسے گیٹ کے کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ''نہیں''...... علی محمد کے جواب نے اس کے سامنے گیٹ کو اور جیسے بڑا کر دیا''۔ پھر یہاں کیوں رک گئے۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر پوچھ بیٹھا۔ ''آٹھ سال ہو گئے۔ منی آٹھویں جماعت میں تھی۔ ایک دن صبح اسکول کے لئے نکلی پھر واپس نہیں آئی''۔ علی محمد نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا...... ''واپس نہیں آئی''۔ راجیش جیسے سکتے میں آ گیا...... ''نہیں وہ واپس نہیں آئی''...... علی محمد کی آواز جیسے بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ ''اس روز جب تین بجے چھٹی ہوئی اور وہ بچوں کے ساتھ باہر آئی۔ اسی وقت اسی جگہ پر ایک زور دار دھماکہ ہوا''۔ علی محمد کی آواز رندھ گئی۔ ''وہ مر گئی، اور بھی بچے مر گئے'' راجیش علی محمد کے پاؤں کے نیچے زمین کو دیکھتا رہا۔ ہمت کر کے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ علی محمد سڑک پار کر کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اس نے بوجھل قدموں کے ساتھ سڑک پار کی اور علی محمد کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلنے لگا۔ لال چوک کی دوسری طرف چلتے چلتے علی محمد ایک دکان کے سامنے رک گیا۔ راجیش جیسے گھسیٹتے ہوئے خود کو وہاں تک لایا۔ دونوں کچھ دیر نیچے زمین کو تکتے رہے۔ پھر علی محمد نے بڑی صاف آواز میں کہا۔ ''یہ دکان دیکھتے ہو۔ دو سال ہوئے ایک دن

صیف یہاں کراس فائرنگ میں مارا گیا۔اس کی لاش دو دن اس دکان میں پڑی رہی‘‘۔
راجیش آنکھیں بند کئے جیسے صیف کی لاش کو دکان میں پڑا دیکھتا رہا۔وہ چند لمحے اسی طرح
کھڑا رہا۔پھر آنکھیں بند کئے واپس مڑا۔آنکھیں کھولیں،سامنے سب کچھ دھندلا دھندلا
تھا۔علی محمد سڑک کے پاس اس کا انتظار کر رہا تھا۔اسے لگا علی محمد تک پہنچنے کے لئے درد کا
دریا پار کرنا ہے۔اسے یقین تھا سڑک کے پار اسے جاوید سے ملنا ہوگا۔یہ سوچتے ہی اس کا
دل بیٹھ گیا۔وہ گرا ہی جا رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ علی محمد اسے اشارے سے بلا رہا ہے۔
اس نے آنکھیں بند کیں اور علی محمد کے اشارے کو زور سے پکڑ کر سڑک پار کی۔علی محمد داہنی
طرف دیکھ رہا تھا۔راجیش بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے حلق سے صرف اتنا ہی نکلا ’’علی
محمد اب مجھے کسی سے نہیں ملنا،اب واپس گھر چلیں‘‘۔اب کس سے ملنا ہے؟اب میں تمہیں
کہیں اور نہیں لے جاؤں گا۔بس ذرا اس خستہ عمارت کی طرف دیکھو......اب بھی علی محمد کی
آواز جیسے میلوں دور سے سنائی دے رہی تھی۔جس کے سنتے ہی راجیش جیسے سڑک کے
درمیان بکھر کر رہ گیا۔وہ خستہ عمارت کی طرف نہ دیکھ سکا۔وہ علی محمد کو دیکھتا رہا جو کہہ رہا
تھا......’’جاوید کو بزنس کا بڑا شوق تھا۔اس نے تعلیم پوری کی بس اب تمہارا ہی انتظار تھا کہ
اچانک ایک دن شام گھر آتے ہوئے کراس فائرنگ کے دوران اس عمارت میں جان
بچانے کی غرض سے چھپ گیا۔دوسرے دن ملبے سے اور لاشوں کے ساتھ ساتھ اس کی ادھ
جلی ہوئی لاش بھی ملی‘‘۔......’’آؤ واپس گھر چلیں‘‘۔علی محمد نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے
میں کہا اور پھر سڑک پار کی۔راجیش نے دائیں بائیں دیکھا ہر طرف اسے صرف لاشیں چلتی
پھرتی نظر آئیں جن کی بدبو سے اسے گھٹن محسوس ہونے لگی۔سڑک کے پار دیکھا۔علی محمد

سڑک کے اس پار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنے سے دور ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید اس بار وہ اس درد کے دریا کو پار نہ کر پائے گا۔ اتنے میں ادھر جہاں علی محمد کھڑا تھا، ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ راجیش اس پار سب دیکھتا رہا۔ وہ دیر تک بت بنا کھڑا دیکھتا رہا کہ اچانک کسی نے اس سے پوچھا ''بھئی، وہاں کیا ہوا''۔ راجیش نے مشینی انداز میں ہاتھ اٹھا کر ادھر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' ابھی ابھی وہاں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ علی محمد مر گیا۔ ابھی اس کی لاش ادھر ہی پڑی ہے۔''!!!

............☆☆☆............

بازیافت

عصر سے ہی محلے کی اندرونی مسجد کے قریب احدلون کے گھر میں آج ہلکی چہل پہل دیکھی گئی۔ آس پاس کے ہمسائے تذبذب میں تھے کہ برسوں بعد آج اچانک احد لون کے گھر میں چہل پہل کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مغرب کے قریب سارے محلے میں احد لون کے گھر میں چہل پہل کے متعلق مختلف قسم کی قیاس آرائیاں عروج پر تھیں......عشاء پر مسجد سے نماز کے بعد جب احدلون دوسرے محلے والوں کے ساتھ باہر آیا۔ محلے والے برسوں بعد اسے قدرے مطمئن اور پُرسکون دیکھ کر پوچھ بیٹھے...... ''احدلون، کیا بات ہے۔ اسلم کی کوئی خیر خبر ملی ہے؟''...... ''ہاں''......احدلون نے ٹھہرے ہوئے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا...... ''کہاں تھا، کب آرہا ہے، آیا تو نہیں ہے''۔ کسی نے قدرے جذباتی ہو کر پوچھا...... ''اسلم نہیں آرہا ہے''۔ احدلون نے اُسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
''اس کی قبر ملی ہے''۔

............☆☆☆............

جہلم اور فرأت کے درمیان

عمّہ جو چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر حقہ لے کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک لمبا کش لے کر قدرے اطمینان سے سوچنے لگا......لوگ غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔اب حالات بالکل ٹھیک ہیں...... جبھی پچھلے کئی دنوں سے فجر کے وقت مسجد نمازیوں سے بھری رہتی ہے۔ مجھے واقعی کسی کے چہرے پر خوف جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی، جیسے کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔صرف چند ہی محلے والے فجر کے وقت مسجد میں آتے۔ وہ بھی ڈرے ڈرے، خوف زدہ۔اب تو حالات بالکل بدل گئے ہیں۔اُس نے قدرے اطمینان سے دوسرا کش لگایا۔ دھواں چھوڑتے ہوئے پھر سوچنے لگا......''اگر ایسا ہے تو میں ہی کیوں دن بھر کمرے میں پڑا رہتا ہوں''۔اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے حقہ کا آخری کش لیا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔کمرے میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ایک طرف کونے میں پڑے کپڑوں پر نظر پڑی۔اس نے چھانٹ کر اپنے لئے قمیض، شلوار اور واسکٹ نکالی اور قدرے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے جو پہلے پہنے کپڑوں سے کسی بھی صورت میں مختلف نہیں تھے۔

ہاتھوں سے شلوار اور قمیض کی سلوٹیں درست کیں اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ سامنے دوسرے کمرے کے بند دروازے کو چند لمحے دیکھتا رہا۔ کچھ سوچ کر اس کی طرف ایک دو قدم بڑھائے، قریب پہنچ کر دستک دینے کے لئے داہنا ہاتھ اٹھایا اور آواز دینے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہا کہ اچانک یہ سوچ کر رُک گیا...... ''نہیں واپسی پر جگاؤں گا۔ رات کو دیر سے سویا ہے''...... بند دروازے پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور سیڑھیاں اُترتے ہوئے آنگن میں آ گیا۔ مڑ کر پورے گھر کو ایک بار بھرپور نظروں سے دیکھا اور آنگن کا باہری دروازہ کھول کر اسے اطمینان سے بند کر کے گلی میں دور تک نظریں دوڑائیں، گلی کا ماحول دیکھ کر اس کے خیال کو تقویت ملی کہ اب حالات واقعی بالکل ٹھیک ہیں۔ سکولی بچے ہنستے کھیلتے بھاری بھاری بستے لئے رنگ برنگی وردیوں میں ملبوس جیسے گلی میں خوشبو بکھیر رہے تھے۔ وہ بھی یہ خوشبو سونگھتے سونگھتے بچوں کے ساتھ ہولیا اور گلی ختم ہوتے ہی بڑی سڑک پر آ گیا۔ بازار کی رونق، ہر طرف پہلے جیسی دھکم پیل، ٹریفک دیکھ کر اسے پورا یقین ہو گیا اب حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ اس نے تیز رفتار ٹریفک کے درمیان سے خود کو بچتے بچاتے سڑک پار کی۔ پھر مڑ کر سڑک کی دوسری طرف دیکھنے لگا جہاں سے اس نے سڑک پار کی تھی...... ''اب تو حالات بہت ٹھیک ہیں۔ چند مہینے پہلے یہاں اس سڑک پر صرف آوارہ کتے گھومتے یا بیچ سڑک میں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے ہوتے تھے کتے کی ایک چیخ یا گولی کی آواز میلوں سنائی دیتی تھی۔ اب تو حالات بالکل مختلف ہیں''۔ سوچتے ہوئے قدرے اطمینان سے وہ آگے بڑھنے لگا۔ بھوری کدل چوک کے قریب پھر دائیں طرف والی سڑک کی طرف مڑنا ہی چاہا کہ اچانک رُک گیا۔ ''آج یہاں سے نہیں جاؤں گا''...... ''کیوں؟''...... جیسے اندر سے

کسی نے سوال کیا۔ چند لمحے وہ کھڑا جواب سوچتا رہا۔ پھر بے بس سا ہو کر جامع مسجد کی طرف جانے والی قدرے چھوٹی سڑک پر آگے کی طرف بڑھنے لگا۔ چہرے پر عجیب طرح کی کشمکش اور تذبذب لئے وہ کچھ اور آگے بڑھ گیا اس دوران وہ جیسے اندر ہی سے خود کو کسی غیر مرئی خوف سے محفوظ رکھنے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا اور چہرے پر ظاہر ہوئی کشمکش اور تذبذب قدرے کم ہوا۔ پھر نظریں قدرے اعتماد سے اٹھا کر سامنے دیکھا۔ راحتی دکان پر بیٹھی جیسے اس کی راہ تک رہی تھی۔ وہ اس کے قریب گیا، ایک دوسرے کی خیریت پوچھی اور آگے بڑھ گیا۔ جی میں آیا کہ واپس مڑ جائے لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ قدم آگے بڑھائے، سامنے امیر دین لاٹھی ٹیکتا ہوا دائیں بائیں بظاہر اطمینان سے جیسے کسی کو تلاش کرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس سے بھی مختصر رسمی بات چیت کرنے کے بعد قدم تیزی سے آگے بڑھائے۔ دائیں طرف وستہ ولی کی دکان کے تھڑے پر بیٹھے نور محمد پر نظر پڑی جو نظریں سڑک پر نکائے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی کو زور زور سے بھینچ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے چہرے پر پھر کشمکش اور تذبذب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اپنے اندر بکھائی ہمت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ''کیوں، اب تو حالات بالکل ٹھیک ہیں''۔ اس سوال کا کوئی مناسب جواب نہ سوجھا اور اپنے آپ سے لڑتا بھڑتا وہ بائیں طرف ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد محلے کی اس اندرونی گلی میں مہینوں پہلے والا سناٹا اور ویرانی نظر آئی۔ باہر بڑی سڑک کی رونق اور گہما گہمی کا اس گلی میں کوئی اثر نظر نہیں آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی کی ویرانی اور سناٹا لے کر بڑی سڑک پر آ گیا۔ سڑک کی گہما گہمی اور رونق دیکھ کر اس کے ساتھ لگی گلی کی ویرانی اور سناٹا قدرے کم ہوا۔ سڑک کے اُس

طرف سے کنڈیکٹر کی آواز......''لال چوک، لال چوک''......سن کر اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں پڑی کچھ ریز گاری کو باہر سے ہی ٹٹول کر دیکھا اور یہ سوچتے ہوئے دائیں بائیں تیز ٹریفک سے خود کو پھر بچتے بچاتے سڑک پار کی کہ آج وہ ایک مدت کے بعد لال چوک گھوم کر ہی آئے گا۔ سڑک پار کر کے وہ میٹاڈار میں سوار ہوا اور اوورلوڈنگ میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ لیکن ایک عرصے کے بعد لوگوں کو اپنے اتنے قریب محسوس کرتے ہوئے اسے عجیب طرح کا اطمینان بھی ہو رہا تھا۔ لال چوک پہنچ کر جونہی وہ میٹاڈار سے اُترا۔ لال چوک کی رونق، فراٹے بھرتا ہوا تیز ٹریفک، سجی سجائی بڑی بڑی دکانیں، دکانوں پر لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر اس کے ساتھ لگی اندرونی گلی کی ویرانی اور سناٹا جیسے غائب ہو گیا۔ ''اب تو حالات واقعی بالکل ٹھیک ہیں''۔ اپنے آپ سے بڑبڑاتے وہ آگے بڑھ گیا اور گھنٹوں لال چوک کے اطراف گلی کوچوں، بازاروں میں گھومتا رہا۔ اس دوران ایک جگہ اسے اپنے من پسند حقہ کے کچھ کش بھی میسر آ گئے۔ مغرب کے قریب گھنٹہ گھر کے سامنے بنی نئی کنکریٹ پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ کر اس نے دائیں بائیں سارے لال چوک پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ پھر کچھ اطمینان محسوس کرتے ہوئے پاس ہی کھڑی میٹاڈار میں سوار ہو کر گھر کا رُخ کیا۔ بہوری کدل چوک پار کر کے جونہی وہ میٹاڈار سے اُترا اور اپنے محلے کی گلی میں داخل ہوا، اُسے اندر ہی اندر جیسے محسوس ہونے لگا کہ پار والی تنگ گلی کا سارا سناٹا اور ویرانی اس کے تعاقب میں ہے۔ ''نہیں، یہ میرا وہم ہے۔ ایسا کچھ نہیں۔ اب حالات بالکل ٹھیک ہیں''۔ پھر اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے جیسے اندر ہی اندر کوئی اہم اور زبردست فیصلہ کر لیا جس سے چہرے پر اعتماد اور اطمینان کی ہلکی لہر سی اُبھر آئی۔ اس نے آنگن کا دروازہ کھولا اور پھر گھر کا باہری

دروازہ کھول کر اوپر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی دائیں طرف کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر اعتماد اور اطمینان نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کچھ اور ہو جاتا اس نے ابھی باہر گلی میں خود سے کئے ہوئے ارادے کو دہرایا اور بند دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اپنا داہنا ہاتھ دستک کے لئے اٹھایا اور آواز دینے کے لئے منہ کھولنا ہی چاہا پھر اچانک رُک گیا...... ''نہیں، ابھی نہیں، دن بھر کا تھکا ہوا لوٹا ہوگا۔ سویرے جگاؤں گا''...... خود سے بڑبڑاتے ہوئے بائیں طرف اپنے کمرے میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور تذبذب میں عشاء کی اذان اور بند دروازے کے درمیان ڈولتا رہا۔ عشاء کی اذان ختم ہوئی لیکن وہ بدستور اندھیرے میں کھڑا رہا۔ تذبذب میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کیا کرے کہ اچانک کھڑکی سے اندر آتی ہوئی مدھم روشنی نے اس کے تذبذب کو قدرے دُور کر دیا۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا اور سامنے حاجی صاحب کے گھر کو دیکھنے لگا جو روشنی میں نہا رہا تھا۔ اسے یاد آیا آج بجلی کو عشاء کے بعد ہی آنا تھا۔ ارادہ کیا وہ کمرے میں لائٹ آن کرے۔ پھر کچھ سوچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ چند لمحے حاجی صاحب کے گھر کی طرف پھر غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ پرانی یادیں لوٹ آئیں جن کے ساتھ ہی حاجی صاحب کا پُر وقار چہرہ ذہن میں گھوم گیا۔ حاجی محمد سلطان کتنے بڑے دل جگر کا آدمی ہے۔ اس کے پوتے آصف کو آنگن میں کھیلتے کھیلتے اس کے سامنے گولی لگی اور آصف نے اُسی کی گود میں دم توڑ دیا۔ اس کا اندر باہر سب پوتے کے لال لال گرم خون سے سرخ ہو گیا۔ لیکن وہ پہاڑ کی طرح کھڑا رہا۔ یہ سوچتے ہی ذہن میں بیسیوں چہرے گھوم گئے۔ اسے راحتی یاد آئی، جس کے خاوند کو اُسی دکان پر گولی لگی لیکن راحتی نے ہمت نہیں ہاری۔ چند دن بعد خود دکان سنبھالی...... امیر دین کو

اپنے بیٹے سہیل کا برسوں سے کوئی اَتہ پتہ نہیں لیکن وہ بھی لاٹھی ٹیکتا ہوا زندگی جیسے تیسے جی رہا ہے۔نور محمد کی بیٹی کے ہلاک ہونے پر سارے محلے میں صفِ ماتم بچھ گئی لیکن نور محمد نے بھی ہمت نہیں ہاری...... حاجی محمد سلطان کے پوتے آصف، راحتی کے خاوند اکبر اور نور محمد کی بیٹی زینب سب کا جنازہ تو اُٹھا۔ ہزاروں لوگ قبرستان تک گئے، انہیں دفنایا...... فاتحہ خوانی ہوئی۔اب مجھے بھی کوئی بتائے اسلم اور رشید کا کیا ہوا...... میں بھی بڑا جگر والا ہوں۔ محلے والوں کو شاید یاد نہیں جب خدیجہ کی موت واقع ہوئی میں بھی پہاڑ کی طرح کھڑا رہا۔ایک آنسو نہ خود بہایا نہ دوسروں کو بہانے دیا۔ سبھی نے میری ہمت اور صبر کی داد دی تھی۔انہیں کون بتائے میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔ میں بھی جیسے تیسے زندگی جی لوں گا لیکن خدارا مجھے بتاؤ اسلم اور رشید کا کیا ہوا؟ میں جب بھی پوچھتا ہوں کہتے ہیں اسلم باہر کسی دھندے میں پھنس گیا ہے۔آج یا کل آئے گا...... بہت زمانہ ہوا اب کب آئے گا؟ رشید کے بارے میں پوچھتا ہوں، کہتے ہیں اندر کمرے میں سویا ہے۔ بہت تھکا ہوا ہے ابھی مت جگانا......"بھلا کوئی اتنی دیر سوتا ہے"؟......"نہیں نہیں میں اسے سویرے جگا کے ہی رہوں گا۔ کہوں گا میں لال چوک کی رونقیں دیکھ کر آیا ہوں۔اب حالات بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔اب کوئی ڈر نہیں......اُٹھو......!!!

............☆☆☆............

زندہ دارانِ شب

کچھ عرصہ بعد پھر ایک واقعہ شہر کے اندرون ایک بڑے چوراہے کے قریب رونما ہوا۔ جہاں ایک تین منزلہ بوسیدہ مکان کے سڑک پر کھلنے والے دروازے کے ساتھ لگے تقریباً آٹھ فٹ لمبے عارضی بنکر نے مکان کو اور زیادہ بوسیدہ بنا دیا تھا۔ جس کے آگے کانٹے دار تاروں نے چوراہے کے تقریباً تین چوتھائی حصے پر قبضہ کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں اطراف میں رہائشی مکانات ملبہ میں تبدیل ہو گئے وہیں یہ عارضی بنکر دیکھتے ہی دیکھتے دو منزلہ کنکریٹ بنکر کی صورت اختیار کر گیا۔ ساتھ ہی تین منزلہ بوسیدہ مکان بھی اسی کا حصہ بن گیا۔ چونکہ آس پاس کے تقریباً سارے مکان کچھ تو بوسیدہ ہو چکے تھے اور کچھ برسوں سے ویران پڑے تھے۔ مکینوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور اکثر ان ہی چند مکینوں کا بنکر کے سامنے آنا جانا رہتا تھا اور بنکر والے بھی اِن سب کی پہچان رکھتے تھے۔ بنکر والے معمول کی طرح روز سویرے ٹولیوں میں گشت کے لئے نکلتے اور شام کو لوٹتے......لیکن چند دنوں گشت سے لوٹنے کے بعد اُنہیں ایک عجیب صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا، شام

ہوتے ہی آس پاس سے کتوں کی ایک فوج اکٹھی ہوکر بنکر کے سامنے بھونکنا شروع کر دیتی تھی جس سے ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتی تھیں۔وہ ہڑ بڑا کر بنکر سے باہر آ کر انہیں ڈرا دھمکا کر بھگا دیتے لیکن جونہی وہ واپس بنکر میں داخل ہو جاتے تھے کتے پھر اکٹھے ہوکر بھونکنا شروع کر دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دنوں تک یونہی چلتا رہا۔آخر ایک رات تنگ آ کر وہ ہتھیار لے کر باہر آئے اور کتوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کی جس سے بہت کتے ہلاک ہو گئے۔ دوسرے دن انہوں نے میونسپلٹی حکام سے رابطہ کیا اور باقی بچے کتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر میونسپلٹی اہلکاروں نے زہر دے کر ہلاک کیا۔بنکر والوں نے سکھ کا سانس لیا۔گوکہ اب بھی رات کو دور سے اِکا دُکا بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں۔کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن بنکر والے اپنے اطراف میں بوسیدہ مکانوں کی جگہ نئی طرز کی عالیشان کوٹھیاں تعمیر ہوتے دیکھ کر تذبذب میں پڑ گئے اُنہوں نے اس نئی صورتِ حال سے مکینوں کو آگاہ کیا۔دوسرے دن سویرے کوٹھیوں کے مکین ان کے پاس آئے اور دیر تک اُنہیں نئی تعمیرات کے پسِ منظر میں حاصل ہونے والے سیاسی مقاصد کا تفصیل سے ذکر کیا جس سے بنکر والوں کا تذبذب دور ہوگیا۔پھر چند ہفتوں ہی میں بنکر کے آس پاس کا سارا منظر بدل گیا۔بوسیدہ اور ویران کچے مکانوں کی جگہ عالیشان کوٹھیوں نے لی۔ نئے ماڈل کی گاڑیاں بنکر کے سامنے گزر کر عالیشان کوٹھیوں کے مضبوط آہنی دروازوں کے اندر داخل ہوکر کوٹھیوں کی شان بڑھاتی رہیں۔مکینوں نے اپنے نام اور پہچان کے بڑے بڑے بورڈ کوٹھیوں پر آویزاں کئے جو رات کے اندھیرے میں بھی جگمگاتے تھے۔لوگوں کی ایک بڑی تعداد دن بھر کوٹھیوں کے مالکوں سے ملنے آتی۔ پہلے پہل بنکر والے لوگوں کی اتنی تعداد دیکھ کر قدرے گھبرائے،لیکن

مکینوں کے سمجھانے پر ان کی گھبراہٹ دور ہوئی۔ کچھ عرصہ اور گزرا کہ اچانک ایک رات پھر کتوں نے بنکر اور رہائشی بستی کے اطراف میں شدت سے بھونکنا شروع کیا۔ بنکر والے ہتھیار لے کر باہر آئے لیکن یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اس بار کتوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ جیسے میلوں تک پھیلی ساری بستی ایک ساتھ بھونک رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے بنکر کے ساتھ ساتھ نئی عالیشان کوٹھیوں کا بھی محاصرہ کیا ہے۔ وہ پھر تذبذب میں پڑ گئے اور ہتھیار لے کر واپس بنکر میں داخل ہوئے۔ اس رات کوٹھیوں کے مکینوں نے کچھ تجسس اور کچھ پریشانی میں اپنے کمروں کی کھڑکیوں کے پردے آہستہ سے سرکائے اور کچھ دیر تک بُت بنے سامنے کتوں کی اکھٹی فوج کو دیکھتے رہے پھر سبھی نے یہ سوچ کر پردے گرادیئے کہ "یہ تو بنکر والوں پر بھونکتے ہیں، ہم پر نہیں......ہم تھوڑے ہی غیر ہیں"۔

یہ سلسلہ کئی راتوں تک چلتا رہا۔ بنکر والوں کو جب کچھ نہیں سوجھا تو انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور کوٹھیوں کے مکینوں کو بلایا۔ دیر تک اس مسئلے پر زبردست بحث ہوئی۔ آخر پر مکینوں نے بنکر والوں پر واضح کر دیا کہ "یہ آپ لوگوں پر بھونکتے ہیں ہم پر نہیں۔ ہم پر کیوں بھونکیں گے، ہم غیر تو نہیں ہیں۔ اس لئے اس مسئلے کو حل آپ کو کرنا ہے ہمیں نہیں"۔ یہ سن کر بنکر والے بہت غصہ ہوئے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ خاموش رہے لیکن اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں بھی سوچنے لگے۔ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ اس دوران بنکر والوں نے یہ کیا کہ ہر رات کو دن بھر کا جھوٹا اور باسی روٹیاں کتوں کی طرف پھینک دیتے تھے۔ جس کا کتوں کے بھونکنے پر کوئی اثر نہ ہوا البتہ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ کتوں کا رُخ عالیشان کوٹھیوں کی طرف ہے۔ یہ بات کوٹھیوں کے مکینوں نے بھی محسوس

کی اور ایک رات سب نے مل کر خوب صلح مشورہ کیا۔ دوسرے دن سویرے ایک کوٹھی کے مکین نے اپنا سارا مال واسباب کوٹھی سے باہر نکالا اور جونہی چند وفاداروں نے مال واسباب ٹرک پر لادنا چاہا۔ اسی اثناء میں دائیں بائیں گلی کوچوں سے ہزاروں کتے غُراتے بھونکتے آئے اور وفاداروں پر جھپٹ پڑے۔ وفادار جان بچا کر بھاگ گئے۔ ڈرائیور ٹرک لے کر دوسری طرف بھاگ گیا۔ مال واسباب وہیں سڑک پر پڑا رہا۔ دو دن بعد چند وردی پوش آئے اور انہوں نے مال واسباب اپنے قبضے میں لیا۔ بنکر والے یہ ساری صورتِ حال دیکھ کر پھر تذبذب میں پڑ گئے اور اس عجیب صورتِ حال کا ذکر اعلیٰ حکام سے کیا۔ جواب میں انہیں خاموشی سے حالات پر نظر رکھنے کی ہدایت دی گئی۔ اس دوران آنے والی راتوں میں مکینوں کو یقین ہو گیا کہ کتوں کا رُخ بنکر کی بجائے اُن کی طرف ہے۔ ایک دو بار رات کو کھڑکیوں کے قیمتی پردے سرکا کر انہوں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔ دوسرے دن وہ سارے بڑی کوٹھی کے مکین کے یہاں جمع ہوئے اور دیر تک آپس میں پھر خوب صلاح ومشورہ کیا۔ اس رات جونہی کتوں نے کوٹھیوں کے اطراف میں گھیرہ ڈال دیا اور شدت کے ساتھ بھونکتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا، اچانک کوٹھیوں کے آہنی دروازے کھل گئے اور مکینوں کے وفادار ہتھیار تانے غصے سے باہر آئے اور کتوں پر گولیوں کی وہ بوچھاڑ کی کہ بنکر والے سہم کر اندر بنکر میں دبک گئے۔ ہزاروں کتے منٹوں میں کوٹھیوں کے اطراف میں ہلاک ہو گئے۔ وفاداروں نے دور دور تک گلیوں کوچوں مرغزاروں میں کتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کو ہلاک کیا۔ پھر پوری طرح مطمئن ہو کر واپس کوٹھیوں کا رُخ کیا۔ مالکوں نے وفاداروں کو شاباشی دی اور کئی راتوں کے بعد قدرے مطمئن ہو کر اپنی اپنی خواب گاہوں کا رُخ کیا۔ صبح سویرے

جونہی بنکر والے گشت کے لئے بنکر سے باہر آئے، سامنے چوراہے کے بیچ آٹھ دس کتوں کے درمیان ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو جو کبھی اُن کی طرف اور کبھی عالیشان کوٹھیوں کی طرف دیکھ رہی تھی، دیکھ کر زبردست تذبذب میں پڑ گئے۔ وہ چند لمحے یہ منظر دیکھتے رہے پھر کچھ سوچ کر واپس بنکر میں داخل ہو گئے۔ ادھر کوٹھیوں کے مالک نرم نرم بستروں سے باہر آئے اور قدرے مطمئن ہو کر ٹہلتے ہوئے کھڑکیوں کے پاس کھڑے ہو گئے جو چوراہے کی طرف کھلتی تھیں۔ عجیب مسکراہٹ لئے انہوں نے کھڑکیوں کے قیمتی پردے سرکائے اور سامنے چوراہے کے بیچ مہتابہ بیگم کو کتوں کے درمیان بیٹھی دیکھ کر انہوں نے فوراً پردے گرادیے لیکن انہیں اندر سے یقین ہو رہا تھا کہ مہتابہ بیگم اور کتے ان کو بہت قریب سے دیکھ رہے ہیں۔

............☆☆☆............

بُوند بُوند پیاسی

اتوار کی ایک شام، میں بڑی جھیل کے کنارے ایک بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ ماحول پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھار کسی پرندے کی ہلکی شوخ چہچہاہٹ سکوت کو توڑتی مگر جلد ہی جھیل کی گہرائی میں ڈوب کے معدوم ہو کے رہ جاتی۔ میں خود کو اس روح پرور منظر میں ڈبونا چاہتا تھا۔ چند لمحوں کے لئے ہی سہی۔ جہاں میرا ماضی اپنے خوفناک پر پھیلائے میرے تعاقب میں نہ ہوتا۔ میں ایسی ہی چند ساعتوں کیلئے برسوں بھٹکتا رہا۔ جہاں صرف میں زندہ رہتا اور میرا ماضی مر جاتا۔ دفعتاً ایک مریل مگر معصوم آواز۔ ''صاحب پالش'' نے سارے سکوت کو ایک بار پھر توڑ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی دو بڑی بڑی معصوم آنکھیں ویرانی لئے میرے سامنے تھیں۔ ''صاحب پالش'' اس نے میرے جوتوں کی طرف دیکھ کر پھر دوہرایا۔ اس بار اس کی آواز جیسے جھیل کی گہرائی سے آتی محسوس ہوتی...... ''نہیں''۔ میں نے پوری حقارت سے جواب دیا۔ وہ خاموشی سے کندھے اچکاتے ہوئے آگے نکل گیا۔ لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیر تک میرے تصور

میں گشت کرتی رہیں۔ میں نے اسے اتنی حقارت سے کیوں دھتکارا۔ یہ سوچنے کے ساتھ ہی مجھے اندر ہی اندر عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ نہ جانے ان آنکھوں میں کیا تھا۔

وہ میرے آفس کے باہر نکڑ پر صبح سے شام تک لوگوں کے جوتے پالش کرتا ہے۔ میں پچھلے دوسال سے اسے وہیں دیکھتا آیا ہوں۔ ان دوسالوں میں اکثر اپنے جوتے پالش کراتے وقت اس کا معصوم چہرہ اور دو بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ لیکن اکثر عجیب طرح کا خوف غالب آتا۔ ایک دن جوتے پالش کراتے سوچا۔ اسے پوچھوں تجھے کسی اچھے سکول میں زیرِ تعلیم ہونا چاہیئے تھا۔ کیا تمہارے ماں باپ میں اتنی بھی غیرت نہیں۔ نہیں، مجھے اسکے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ ترس میں پھر خوف کا عنصر غالب آیا جس نے حقارت کا لبادہ اوڑھ لیا۔ پتہ نہیں کس گندی نالی کا کیڑا ہے۔ کہاں میں......اور......اندر ہی اندر بڑبڑاتے ہوئے سگریٹ کے ایک لمبے کش کے ساتھ خلا میں انجانے خوف اور حقارت کو دھکیل دیا۔ اس روز پیسے دے کر جب آگے بڑھ گیا۔ اس کی دو بڑی بڑی آنکھیں دیر تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔

جھیل کی سطح پر شام کے دھندلکے پھیلتے ہی مجھے اپنا آپ جھیل کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میرا انجانا خوف اور بڑھ گیا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی نہ تھا۔ پھر بھی......''صاحب پالش'' کی آواز جیسے قریب سے آرہی تھی۔ دل کے کسی گوشے میں چھپی وہی دو بڑی بڑی معصوم آنکھیں میرے جگر کو کاٹ رہی تھیں، نہ جانے کیوں......؟

گھر آکر مجھے اپنا آپ منوں بھاری محسوس ہوتا رہا۔ میں خود کو ابھی سنبھال نہیں پا رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور عبدل ایک زرد لفافہ لئے کمرے میں داخل ہوا۔ ''آپ کا خط''۔ کہتے ہوئے عبدل نے لفافہ مجھے تھما دیا۔ وہ چلا گیا اور میری نظریں خط کے ایک طرف

ایک ہمدرد، ایک عورت، نجمہ اور میں۔ سوچتے ہی میں نے آنکھیں بند کیں۔ تصور میں قوسِ قزح کے سات رنگ بکھر گئے۔ ہر رنگ نجمہ کی پُر شفقت مسکراہٹ لئے میرے وجود کو ڈس رہا تھا۔ میرے ہاتھ نہ چاہتے ہوئے بھی خط کھولنے لگے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک اندھا چلتے چلتے اپنی چھڑی سے راہ ٹٹولتا ہے۔ ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے میں نے آنکھیں کھولیں۔ سرخ روشنائی سے داغدار خط میرے ہاتھ میں تھا۔

......شاہد۔ یہ خط میں نے ضرور تمہارے نام لکھا ہے۔ لیکن یقین کرو یہ سوچ کر نہیں کہ تم اسے پڑھو بلکہ تمہارے اندر اس شاہد کے نام جسے میرے سوا شاید ہی دوسرا کوئی جانتا ہے۔ میں اس وقت شہر کے ایک سینی ٹوریم کے ایک وارڈ میں اپنی آخری سانس اس خط میں دفن کر رہی ہوں۔ برسوں سے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ رونے کی بہت کوشش کی۔ لیکن آنسوؤں نے ساتھ نہ دیا۔ بوجھ بڑھتے بڑھتے ایک موذی مرض بن گیا جس میں تمہارا دیا ہوا زہر بھرا ہے۔ شاہد تم مجھے کیسے بھول گئے جبکہ مرتے مرتے میری زبان پر تمہارا نام ہے۔ شاہد میں نے تمہیں بہت کچھ دیا۔ بہت کچھ۔ تم نے مجھے کیا دیا۔ دکھ درد، ذلت، رسوائی۔ اور تم دے بھی کیا سکتے تھے مرد ہو نا۔

......شاہد وہ دن یاد ہے، جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تم بس سٹاپ کے قریب ہی ایک لوہے کے جنگلے سے ٹیک لگائے خلاؤں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہے تھے۔ میں تمہیں اس طرح خلاؤں میں تکتے ہوئے دیکھ کر اپنی سدھ بدھ کھو کر تمہیں دیر تک دیکھتی رہی۔ تمہارا فوٹو کچھ دن پہلے ایک رسالے میں چھپا تھا۔ تمہارا ایک افسانہ بھی شائع ہوا تھا

جس کا عنوان آج بھی یاد ہے۔ ''فریبی'' تھا نا۔ مجھے تمہارا وہ کردار ''فریبی'' محسوس ہوتا ہے کہ تم ہی ہو۔ میں وہ افسانہ کبھی نہ پڑھتی۔ پتہ نہیں تمہاری معصوم صورت نے مجھ پر کیسا جادو کیا۔ میں نے اپنی کتاب تمہارے نزدیک آ کر گرا دی۔ تمہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تمہارے چہرے کی تمام معصومیت نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے چھوٹنے لگے۔ شاہد تمہاری یہی معصوم ادا مجھے اور بھی بھا گئی۔ تم نے کانپتے ہاتھوں سے کتاب اٹھا کر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے کتاب لے کر تمہاری طرف دیکھا۔ لیکن تم نے فوراً نظریں جھکا دیں۔ معصوم تھے نا۔

دوسرے دن کالج سے نکلتے ہی میں نے تمہیں اپنا منتظر پایا۔ اور شاہد ہم ایک ایسی ان دیکھی ڈور سے بندھ گئے جسے صرف محسوس کیا جاتا ہے۔ میرے دل میں تمہارے لئے پیار تھا۔ ایک عقیدت تھی۔ تمہارے دل میں کیا تھا؟۔ وقت گزرتا گیا۔ دو سال کے عرصے میں ہم ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ تم ہر ہفتے دو ہفتے بعد اپنا نیا افسانہ لکھ کر لاتے۔ تمہارے افسانے پڑھ کر مجھے عجیب سا سکون ملتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے جاگتے سوتے میرے تصور میں تمہارے افسانوی کرداروں کے ساتھ ساتھ تمہارا معصوم چہرہ بھی گھومتا رہتا۔ شاہد، تمہیں ماننا پڑے گا، میں نے تمہیں لکھنے کے ایک نئے انداز سے روشناس کرایا۔ تمہارا ہر افسانہ سطحی جذبات پر مبنی ہوتا تھا جس میں ہر کردار تمہاری طرح معصوم جذباتی نظر آتا تھا۔ لیکن میں نے تمہیں زندگی کی ان ٹھوس حقیقتوں سے آشنا کیا جن کی عکاسی کرنے سے تمہارا قلم پہلے قاصر تھا۔ جس کا تم نے خود بھی اعتراف کیا۔ پھر آئے دن تمہارا کوئی نہ کوئی افسانہ وادی سے باہر بھی چھپنے لگا۔ کچھ عرصہ میں تمہارا شمار وادی کے سرفہرست افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ اسی دوران ایک دن تم نے باتوں باتوں میں اپنے ناول 'رات روشن تھی' کے متعلق بتایا۔ اور یہ بھی

کہا کہ دوسری بار جب ہم ملیں گے میرا پہلا ناول میرے ہاتھ میں ہوگا۔ چھ مہینے میں نے کیسے گزارے وہ تم کبھی بھی نہ جان سکو گے۔ پھر ایک دن اچانک جب تم مجھ سے ملے، تمہارے ہاتھ میں پہلے ناول کا مسودہ تھا جسے دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔لیکن شاہدؔ تمہیں یاد ہے تم کتنا دل برداشتہ تھے۔تم خودکشی کی حد تک مایوس ہو چکے تھے۔ کیوں کہ کوئی پبلشر تمہارا ناول چھاپنے کے لئے تیار نہ ہوا تھا۔تم ٹی بی کے مریض کی طرح زرد پڑ چکے تھے۔تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے وہ زیور بیچ ڈالے جو ماں نے مرتے وقت یہ کہہ کر دیئے تھے ”بیٹی انہیں سنبھال کے رکھنا۔ میرے پاس تمہیں دینے کیلئے اور کچھ نہیں ہے۔“ صرف تمہارے زرد مرجھائے چہرے پر ایک مسکراہٹ دیکھنے کیلئے......

......وہ دسمبر کی ایک ٹھٹھرتی سرد رات تھی۔ میں اپنے کمرے میں سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔صرف تمہارے ناول کے بارے میں سوچتی رہی جو چھپ کر آ رہا تھا۔ شام تک تمہاری راہ تکتی رہی۔تم نہیں آئے۔ پتہ نہیں کیا کیا سوچ کر کروٹیں بدلتی رہی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں گھبرا گئی۔اتنی رات گئے کون ہوسکتا ہے۔لیکن فوراً ہی تمہارا دُھندلا عکس تصور کے پردوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا۔دروازہ کھولا۔تمہارا پُرسکون چہرہ دیکھ کر مجھے میرے زیور مل گئے۔تمہارے ہاتھوں میں تمہارا ناول تھا۔تمہاری صرف تخلیق تھی۔ میری تو ماں تھی۔شاہدؔ، یاد ہے تم نے اتنی رات گئے آنے کی وجہ یہ بتائی کہ یار دوستوں میں کچھ زیادہ ہی مصروف رہا......کیا واقعی ایسا ہی تھا......تم سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔تم نے ناول میرے ہاتھوں میں تھما دیا اور آتش داں کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے کھڑے کھڑے کئی بار ناول کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔یقین نہیں آ رہا تھا۔میری آنکھیں بھر آئیں۔تمہاری طرف دیکھا۔تمہارا چہرہ بھی کھلا ہوا تھا۔تم میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھنے

لگے۔اس طرح مجھے دیکھنے کا انداز کچھ دوسرا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا تم دل سے کچھ کہنا چاہتے ہو۔ میں قدرے مسکراتے ہوئے تمہاری طرف بڑھی۔ میں تمہارے اور قریب آئی۔ تمہارے دل کی بات کو دل سے سننا چاہتی تھی۔لیکن......اچانک تمہارا کھلا ہوا چہرہ کالے پتھر کی طرح کالا ہوگیا۔تم ایک وحشی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میں بت بنی تمہیں دیکھتی رہی۔ میرا ذہن ماؤف ہوگیا۔اسی دوران زمین پھٹ چکی تھی،آسمان تھراتھرا گیا تھا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا۔نہ زمین پھٹ چکی تھی۔نہ آسمان تھراتھرایا تھا۔ چندلمحوں کیلئے آکاش کی وسعتوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔ایک معصوم پھول اپنی خوشبو کھو چکا تھا۔ شاہد......نہ جانے کتنے دنوں تک میں اسی کمرے میں روتی تڑپتی رہی...... چندہی دنوں میں تمہارے ناول کے خوب چرچے ہونے لگے۔ میں نے دوبار تمہارا ناول پڑھا۔آج بھی میرے سرہانے پڑا ہے۔اس لئے نہیں کہ یہ تمہارا ہے بلکہ اس لئے اس میں میرا بھی حصہ ہے۔میری ماں کی امانت ہے۔ میں ٹیوشن کر کے اپنی تعلیم پوری کررہی تھی جو پوری نہ ہوئی۔ سنبھلنے کی بہت کوشش کی۔نہ سنبھل سکی۔بکھرتی گئی۔شاہد میری ہر آہ، ہر سانس ایک افسانہ تھی۔لیکن تم نے کبھی بھی میری آہوں کو سمیٹ کر لکھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ کام میں اس وقت سینی ٹوریم کے اس وارڈ میں کررہی ہوں۔ جہاں میں پچھلے کئی مہینوں سے موت کا انتظار کر رہی ہوں۔شاہد...... مجھے یقین ہے۔ یہ خط پڑھتے ہی شاید تم اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو گے۔چندلمحوں کیلئے ہی سہی۔لیکن میں چاہتی ہوں اپنے آپ سے نفرت کا یہ سلسلہ طویل ہو۔تمہاری راتیں ویران ہوں۔اگر یقین نہ آئے تو اپنے آفس کے باہر سڑک کے نکڑ پر اس معصوم لڑکے کو دیکھا کرو جو صبح سے شام تک لوگوں کے جوتے پالش کرتا ہے......!

............☆☆☆............

گلی بُلا رہی ہے

پندرہ سال بعد اچانک شہرِ خاص کے ایک گنجان محلے کی بڑی سڑک پر کھلنے والی ایک قدرے چوڑی گلی میں کنکریٹ بنکر کے ساتھ ساتھ ملحقہ دو مکانوں کو فوجی جونہی خالی کر گئے تو گلی کے اطراف میں دور دور تک خوشی کی ایک عجیب لہر دوڑ گئی؟......بنکر خالی ہوتے ہی گلی کے نکڑ پر آس پاس سے آوارہ کتے آ کر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں آوارہ کتوں کی ایک خاصی تعداد نکڑ پر جمع ہو گئی۔ پھر جیسے ہی انہیں یقین سا ہو گیا کہ اب گلی کے اندر جانے میں کوئی خطرہ نہیں، وہ ایک ساتھ گلی میں گھس گئے۔ گلی کے اندر پہنچتے ہی چند ایک خالی بنکر اور ملحقہ مکانوں میں گھس گئے۔ وہاں دیواروں اور فرش کو کھرچنے لگے۔ اُن میں چند ایک دائیں بائیں زمین کو بہت قریب سے سونگھنے لگے۔ باہر گلی میں آٹھ دس کتے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے رہے۔ دائیں بائیں مکینوں کی بند کھڑکیوں کے سامنے قدرے دھیمے دھیمے انداز میں بھونکنا شروع کیا، جیسے بند کھڑکیوں کے اندر مکینوں کو یقین دلا رہے ہوں، اب گلی میں

آنے جانے میں کوئی خطرہ نہیں؟......فوجی بنکر خالی کر کے جا چکے ہیں۔

شہرِ خاص کے اس گنجان محلے کے مرکز میں اس بنکر کے آس پاس رہنے والوں کی ہی نہیں بلکہ اطراف میں دور دور تک رہنے والوں کی بھی اس بنکر کے ساتھ بہت تلخ اور دل ہلا دینے والی اذیت ناک یادیں وابستہ تھیں۔ جن میں سے کچھ تو گزرتے وقت کے ساتھ ان کے ذہنوں سے محو ہو گئیں اور کچھ کو انہوں نے جان بوجھ کر بھلا دیا تھا۔ تاہم انہیں اب بھی ایک مسلسل ذہنی تکلیف دہ صورتِ حال کا سامنا تھا۔ جسے وہ برسوں سے چاروناچار برداشت کرتے آرہے تھے۔ چونکہ اندرون محلّہ کی دوسری چھوٹی چھوٹی تنگ اور نیم تاریک گلیاں اسی قدرے کشادہ گلی سے مل کر بڑی سڑک پر کھلتی تھیں جو فجر کی اذان کے ساتھ ہی جیسے جاگ اُٹھتی تھی۔ پھر دن بھر ہر طرح کی چہل پہل، گہما گہمی، شوروغل اور رات گئے تک آوارہ کتوں کی ہڑ بھونگ جاری رہتی تھی۔ اکثر مائیں سویرے بچوں کو ہاتھ سے پکڑ کر اس گلی سے نکل کر نکڑ پر ان کو گاڑی میں سوار کرنے تک وہیں کھڑی دوسری ہم عمر خواتین سے پاس پڑوس کی سدھ بدھ لیتی ہوئے واپس گلی کا رخ کرتیں۔ کچھ دیر بعد اندرون محلّہ کی ادھیڑ عمر کی گھریلو عورتیں تازہ سبزی وغیرہ لینے اسی گلی سے وقفے وقفے کے بعد نمودار ہو کر سڑک کے پار تازہ سبزی وغیرہ خریدنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو اپنا دُکھڑا سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر کے قدرے اطمینان سے گلی میں مڑ جاتیں پھر اچانک ایک دن فجر کی اذان سے پہلے مسجد سے کرفیو کا اعلان ہوا دن چڑھے تک گلی کے آس پاس دُور دور تک گہرا سناٹا چھایا رہا لیکن اس بار خلافِ توقع نہ کوئی تلاشی ہوئی نہ کوئی پریڈ۔ دوپہر تک یہ بات اندر ہی اندر سے دور

دور تک پھیل گئی کہ چوڑی گلی کے بیچوں بیچ ایک بڑے بنکر کی تعمیر ہو رہی ہے۔ شام کو دیر گئے کرفیو اٹھا لیا گیا۔ تاہم چوڑی گلی بدستور کرفیو کی زد میں رہی...... جس کے ساتھ ہی اس کے ساتھ دوسری چھوٹی چھوٹی نیم تاریک تنگ گلیوں کا رابطہ کٹ کر رہ گیا۔ چوڑی گلی کی تمام چہل پہل، گہما گہمی، شور و غل، رات گئے تک آوارہ کتوں کی ہڑ بھونگ یکسر ختم ہو گئی اور محلے والوں کو اور دوسری دقتوں کے ساتھ ساتھ بڑی سڑک تک پہنچنے کے لئے نیم تاریک لمبی لمبی تنگ گلیوں سے گزرنے کے دوران اور بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا...... اور یہ ذہنی تکلیف دہ صورتِ حال وہ برسوں سے برداشت کرتے آرہے تھے...... پھر اچانک اتنے طویل عرصے کے بعد جونہی انہیں بنکر کے خالی ہونے کی خبر ملی وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ مغرب سے پہلے پہلے اطراف میں دور دور تک گھروں کے اندر یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ آس پڑوس میں خوشی خوشی یہ خبر بار بار دہرائی گئی۔ اکثر گھروں میں رات گئے تک گلی سے متعلق ماضی کی کچھ خوبصورت یادوں کو یاد کیا گیا...... دوسرے دن سویرے سے ہی گلی کے مکین اور آس پاس کے رہنے والے علاقے کے بڑے چوک میں ایک دوسرے سے گلے ملتے رہے اور مبارک باد دیتے رہے۔ کچھ دیر بعد دفتروں سے فون پر ایک دوسرے کو گلی سے گزرنے کا تجربہ خوشی خوشی اور فخر کے ساتھ بیان کیا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں بڑی سڑک کے پار سبزی وغیرہ خریدنے کے دوران خاموشی سے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتی رہیں۔ مغرب سے پہلے پہلے گھر پہنچ کر مکینوں نے پھر ایک دوسرے سے فون پر بنکر کے خالی ہونے اور گلی کے پھر سے کھل جانے پر خوب تبصرہ کیا۔ اکثر گھروں میں پھر گلی سے متعلق ماضی کی کچھ

خوبصورت یادوں کو دہرایا گیا......لیکن عشاء سے پہلے پہلے تک ابھی بھی آوارہ کتے خالی بنکر اوراس کے ساتھ ملحقہ مکانوں کے اندر دیواروں کو کھرچ رہے تھے اور کچھ دائیں بائیں فرش کو بہت نزدیک سے سونگھ رہے تھے۔ باہر چوڑی گلی میں آٹھ دس کتے اب بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑیں لگا رہے تھے اور ساتھ ہی دائیں بائیں مکینوں کی بند کھڑکیوں کے سامنے قدرے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ جیسے انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہوں اب گلی آزاد ہے......آؤ گلی بلا رہی ہے۔

............☆☆☆............

سانحہ

ساتویں دن وہ شہر کے بڑے چوک کے درمیان قیمتی پتھروں سے بنے بڑے فوارے کے قریب جمع ہو گئے اور خاموشی سے فوارے کے گرد چکر لگانے لگے۔ خوف وتذبذب سے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ان کی سانسیں زور زور سے پھول رہی تھیں۔ دوپہر کے قریب قریب، دُور دُور سے ان کے بہت سے ساتھی آ کر ان میں شامل ہو گئے، جنہیں دیکھ کر ان کی کچھ ہمت بندھی۔ خوف وتذبذب کی بجائے ان کے چہروں پر اب غصہ نظر آنے لگا۔ سبھی نے نظریں اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا پھر فوارے کے گرد گول دائرے میں بنی چار فٹ اونچی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر تک ان کا ایک ساتھی یہ سب دیکھتا رہا۔ جب وہ سارے تھک ہار کر ہانپنے لگے۔ اُن کے چہرے مایوسیوں اور خوف میں ڈوبنے لگے۔ اسی دوران دور بیٹھا ساتھی ایک ہی جست میں فوارے کی دیوار پر چڑھ دوڑا۔ اس نے سامنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر دائیں بائیں دور دور تک نظریں دوڑائیں اور ان سے مخاطب ہوا۔ ساتھیو! تم یہ سڑکیں، یہ بازار، پارکیں، باغ بغیچے، دائیں

بائیں یہ عمارتیں دیکھ رہے ہو؟ کچھ دن پہلے یہاں لوگوں کی کتنی ریل پیل رہتی تھی۔ یہ سڑکیں بازار، سکول، پارکیں، باغ بغیچے لوگوں سے بھرے بھرے ہوتے تھے۔ جس جگہ ہم ہیں یہاں گھنٹوں ٹریفک جام لگتا تھا۔ کہاں گئے وہ سب لوگ، وہ اسکولی بچے کہاں گئے، وہ باغ بغیچوں کی رونقیں کیا ہوئیں، ساتھیو! ایسے سانحے یہاں پہلے بھی گزرے ہیں لیکن ساتھیو! اگر ہم اس سانحہ پر بھی خاموش رہے تو شاید ہمارے دائیں بائیں یہ سڑکیں، بازار، باغ، پارکیں، آنگن سب قبرستان بن جائیں گے، پھر شاید تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ یہ سانحہ کتنا اندوہ ناک اور ڈراؤنا ہوگا۔ ''نہیں نہیں، ہمیں اس کا اندازہ ہے۔ اسی لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ کا سب سے بدترین اور اپنی نوعیت کا واحد سانحہ ہوگا۔'' اُس کے سامنے بیٹھے سبھی ساتھیوں نے ایک زبان ہوکر کہا۔ ''ہاں ساتھیو! ایسا سانحہ شاید انسانی تاریخ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ وہ سانحہ پیش آئے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیئے اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ تلاش کرنا چاہیئے''۔ اس نے غور سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ سامنے بیٹھے سبھی ساتھی کھڑے ہوگئے اور زور زور سے چلّانے لگے۔ ''ضرور، ضرور''۔ ہمیں اس سے بچنے کا کوئی راستہ تلاش کرنا چاہیئے۔ ان کی آوازیں سنسان ماحول کو چیرتی ہوئیں اردگرد چناروں میں بیٹھے پرندوں تک آپہنچیں جو کچھ سوچ کر اپنے اپنے گھونسلوں سے نکل کر ان میں شامل ہوگئے۔ پھر آپس میں مشورہ کرکے انہوں نے کچھ قراردادیں پاس کیں اور آنے والے سانحہ سے بچنے کے متعلق ایک کمیٹی تشکیل دی جسے اپنی رپورٹ دوسرے جلسے میں پیش کرنے کو کہا گیا۔

اُس روز شام کو ٹیلی ویژن پر خاص خاص خبروں میں یہ خبر نمایاں تھی کہ آج شہر میں

ساتویں روز بھی سخت ترین کرفیو نافذ رہا، جس کے دوران حالات پُرسکون رہے۔شہر کے کسی بھی حصے سے کسی ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع نہیں۔صرف شہر کے بڑے چوک کے درمیان فوارے کے قریب کچھ آوارہ کتوں نے اچانک نمودار ہو کر وہ ہڑبھونگ مچادی کہ آس پاس کے درختوں میں پرندے بھی اپنے گھونسلوں سے نکل کر اِدھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگے۔آوارہ کتوں کو پہلے ڈرا کر بھگانے کی کوشش کی گئی جس کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔پھر ٹیئر گیس اور لاٹھی چارج کرنا پڑا جس میں چند ایک زخمی ہو گئے ،لیکن وہ ماحول کو خراب کرنے پر اَڑے رہے۔پھر مفادِعامہ کے تحفظ کی خاطر گولی چلانا پڑی جس کے دوران کتے آس پاس کے مکانوں اور دوسری عمارتوں میں چھپ گئے۔مجبوراًوہاں چند عمارتوں کو بارود سے اڑانا پڑا، جس کے ساتھ چند چنار بھی خاکستر ہو گئے، کیونکہ یہ یقین ظاہر کیا جارہا تھا کہ چناروں کی آڑ میں بھی کچھ آوارہ کتے چھپے ہیں۔سرکاری ترجمان نے مزید بتایا کہ اس معمولی کارروائی سے ممکنہ ایک بڑے سانحہ کو قبل از وقت بڑی ہوشیاری سے ناکام بنادیا گیا۔

............☆☆☆............

کرب زار

گھر سے نکلتے وقت ظہور کو اپنا من عجیب طرح کے بوجھ تلے دبا دبا سا محسوس ہو رہا تھا۔ گلی سے گزرتے ہوئے وہ ٹھہر ٹھہر کر سوچنے لگا...... ایسا کیوں ہو رہا ہے۔؟ ساتھ ہی کل دِن بھر کی مصروفیات کا جائزہ لینا شروع کیا...... دفتر میں معمول کی طرح کام کاج ہوتا رہا۔ صاحب سے بھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی...... گھر میں بھی سب تقریباً ٹھیک ٹھاک ہی رہا...... سویرے دوائی بھی لی...... کوئی ایسا بُرا خواب بھی نہیں دیکھا...... پھر میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے؟۔ قدرے جھنجھلاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا...... باہر بھی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا...... لیکن...... اندر سے من اور بھاری محسوس ہونے لگا۔ جی میں آیا یہیں سے واپس گھر جائے اور دن بھر بستر میں پڑا رہے۔ پھر خیال آیا...... نہیں، صاحب سے ایک اہم میٹنگ طے ہے۔ پھر ایسی کوئی وجہ بھی نہیں کہ وہ دفتر نہ جائے...... سوچتے ہی تیزی سے چند قدم بڑھائے...... لیکن بوجھ نے پھر دبوچ لیا...... دائیں طرف کھڑے بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائی۔...... کوئی وجہ...... کیا وجہ ہو سکتی ہے؟۔ ذہن پر کافی زور دیا۔ اُسے اچانک یاد

آیا۔ ایسا وہ بہت پہلے تب محسوس کرتا تھا جب فجر کی اذان کے بدلے مسجد سے کریک ڈاون کا اعلان ہوتا تھا۔ پھر گھر سے مسجد کے سامنے بڑے میدان تک جاتے ہوئے راستے میں وہ ایسے ہی عجیب طرح کے بوجھ تلے دبا رہتا تھا...... لیکن اب تو ایسی کوئی بات نہیں ہے...... کہیں میں کسی بیماری کا شکار تو نہیں ہوں۔ سوچتے ہی اُسے خوف سا محسوس ہوا۔ نہیں...... نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ سب میرا وہم ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں...... خود سے قدرے زور سے بڑبڑاتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا...... وہ جلد از جلد دفتر پہنچنا چاہتا تھا۔ دائیں بائیں دُور تک کوئی آٹو رکشا بھی نظر نہ آیا...... اس دوران سڑک کے پار ایک گلی سے اُس کا دوست مجیؔد نکل مسکراتے ہوئے اُس کے قریب آیا...... ظہوؔر قدرے تذبذب میں اُسے دیکھتا رہا...... ''خیریت''...... مجیؔد نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا...... '' ہاں یار خیریت ہے...... بس وہ دفتر دیر ہو رہی ہے''...... مجید نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا...... ''چلو یار میرے ساتھ اگر گاڑی کے بھروسے رہے پھر پہنچے دفتر...... چلو''...... ''ٹھیک ہے۔ آٹو ہی لیتے ہیں...... دفتر ذرا......'' ''آٹو'' مجید نے بات کاٹتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا...... '' کیوں ابھی تنی دیر بھی نہیں ہوئی ہے...... چلو...... پیدل چلتے ہیں...... تم سے کچھ ضروری بات بھی کرنی ہے۔'' ''چلو'' کہتے ہوئے مجیؔد آگے کی جانب بڑھنے لگا...... ظہوؔر قدرے بے بسی اور تذبذب میں اُس کے ساتھ ہولیا...... سڑک پار کرتے ہی مجید نے سامنے ایک گلی کا رخ کیا...... ظہور گلی کی طرف دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا...... ''نہیں یار...... آٹو ہی لیتے ہیں...... میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے''...... ظہوؔر نے معذوری ظاہر کی...... ''تمہاری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم پیدل چلنے سے ہمیشہ

کتراتے ہو...... یہ گلی تمہارے دفتر کے عقب تک جاتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے...... شارٹ کٹ...... پتہ بھی نہیں چلے گا...... میرا اسکول بھی ساتھ ہی پڑتا ہے...... چلو...... تمہارا پرانا محلّہ ہے۔ کبھی کبھی اپنوں کی خبر بھی لینی چاہیئے''...... کہتے ہوئے مجید گلی میں داخل ہوا...... وہ باتیں کرتے ہوئے ایک گلی سے نکل دوسری گلی میں آ گئے۔ اس دوران مجید اُسے بہن کی شادی کی تیاریوں کے متعلق بتاتا رہا۔ پھر ایک لمبی تنگ گلی سے نکل کر جونہی ٹیڑھی سڑک پر آ گئے...... ظہور کو اندر کا بوجھ دوہرا ہوتا ہوا محسوس ہوا...... اُس کے قدم بھاری ہونے لگے...... وہ چور نظروں سے اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا...... ''ایسے چور نظروں سے دائیں بائیں کیوں دیکھتے ہو...... تمہارا اپنا محلّہ ہے۔ کیا کسی سے کوئی لین دین...... میرا مطلب ہے''...... مجید نے کریدتے ہوئے پوچھا...... ''نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں...... بس وہ یونہی''...... ظہور نے بات کو ختم کرنا چاہا...... ''نہیں ایسا ویسا کچھ نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کسی پرانی شناسائی نے قدم روک دیئے......'' مجید نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا...... ''نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں...... میں بہت پریشان ہوں۔ گھر سے نکلتے ہی دِل کو عجیب وسوسوں نے گھیر لیا ہے۔ کچھ سوجھتا نہیں......'' کہتے ہوئے ظہور نے اپنا بوجھ قدرے ہلکا کیا...... ''کوئی بات نہیں، دفتر سے نکل کر سیدھے میرے پاس آنا۔ میں تمہیں ایک بزرگ کے پاس لے جاؤں گا۔ ایک نظر میں تمہارے سارے وسوسے دور کر دے گا......'' مجید نے ہمدردی سے کہا۔ ظہور کو قدرے اطمینان ہوا۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ اچانک دائیں طرف ایک تنگ گلی سے نوری دوڑتی ہوئی آئی اور ظہور کو گریبان سے پکڑ کر زور زور سے چلا چلا کر پوچھنے لگی...... ''اب بتاؤ میرا اقبال کب آئے گا...... خود تو چلے آئے۔ میرے اقبال کو وہیں

چھوڑ آئے۔ابھی پریڈ ختم نہیں ہوئی کیا......؟ جب بھی پوچھتی ہوں یہی کہتے ہو بس پریڈ ختم ہوتے ہی آئے گا......ابھی پریڈ ختم نہیں ہوئی...... بولو‘‘......نوری اُسے گریبان سے پکڑ کر ایسے ہی سوالات پوچھتی رہی......ظہور رنگے ہاتھوں پکڑے گئے مجرم کی طرح سر جھکائے کٹی پتنگ کی طرح اُس کے سامنے......ڈولتا رہا......ایک دو بار مجید نے ہاتھ بڑھا کر ظہور کو چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔نوری کے چیخنے چلانے سے آس پاس کی گلیوں سے کچھ عورتیں اور بزرگ اُن کے پاس جمع ہو گئے۔نوری نے اُن کی طرف دیکھ کر روتے روتے کہا......’’جانتے ہو......یہی ہے۔جس کے ساتھ اقبال گیا تھا۔جاتے ہوئے میں نے کہا تھا۔اقبال کو بھی اپنے ساتھ لانا......کہا تھا نا......‘‘نوری نے ظہور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا......’’ہاں کہا تھا......‘‘ ظہور نے دائیں بائیں جمع بھیڑ کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا......وہ سبھی دونوں کو بے بسی سے دیکھتے رہے۔اس دوران نوری کا غصہ قدرے کم ہوا۔چند عورتیں قریب آئیں اور ظہور کو چھڑا لیا اور مجید ظہور کو لے کر ایک پاس والی گلی میں داخل ہوا اور پوچھا......’’ظہور......یار......یہ کیا ماجرا ہے......اُس نے ایسا کیوں کہا؟ تیرے ساتھ......یہ اقبال......پریڈ......یہ سب کیا ہے......؟‘‘۔ظہور اُسے چند لمحے دیکھتا رہا۔جیسے کچھ یاد کرتا ہو‘ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا......’’یار۔کیا بتاؤں۔دس سال پہلے کی بات ہے۔ایک صبح سویرے مسجد سے کریک ڈاؤن کا اعلان ہوا۔سب مرد گھروں سے نکلے۔اقبال دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔نوری نے کہا اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔واپسی پر اپنے ساتھ ہی واپس لانا......ابھی چائے بھی نہیں پی......‘‘،’’پھر کیا ہوا‘‘ مجید نے تذبذب اور تجسس بھرے لہجے میں پوچھا......ظہور جیسے وہ دِن یاد

کر کے بولا......''پریڈ شروع ہوئی......اقبال کی شناخت ہوئی۔ اُسے قریب ہی ایک جیپ
میں دھکیل دیا گیا۔ کریک ڈاؤن ختم ہوا۔ ہم گھر آئے......نوری نے مجھ سے پوچھا۔ اقبال
کہاں ہے...... میں نے یونہی دل رکھنے کو کہا......ابھی پریڈ ہو رہی ہے۔ آتا ہی ہوگا......
دوسرے ہمسایوں نے بھی شاید ایسا ہی کچھ کہا......بس وہ دن اور آج کا دن۔ اقبال کا کہیں
کوئی اتہ پتہ نہیں...... پہلے پہلے ہم سب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی......لیکن اس کے
ذہن میں وہی پہلی بات بیٹھ گئی......''آتا ہی ہوگا......'' اور میری ہمیشہ یہی حالت ہوتی
تھی۔ بعد میں ہم نے مکان ہی بیچ دیا...... پھر بھی میں جب کبھی یہاں سے گزرتا ہوں،
میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے......'' کہتے ہوئے ظہور کو اپنا آپ مَنوں بھاری محسوس ہوا......
مجید اس کی حالت بھانپ کر اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا......''تم ہمت سے کام لو۔ اللہ
سب ٹھیک کرے گا...... چلو......دفتر دیر ہو رہی ہے......'' دو تین قدم چلنے کے بعد ظہور نے
مڑ کر مجید سے عجیب لہجے میں پوچھا......''یار، یہ پریڈ کب ختم ہوگی......؟!!!''۔

............☆☆☆............

وہ کون ہے

ہوائی جہاز سے باہر آتے ہی سیڑھیاں اُترتے ہوئے وریندر شرما کے افرادِ خاندان کا جب ہلکی ہلکی دھوپ اور قدرے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے استقبال کیا، تو وہ نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو کچھ سمجھانے لگا۔ جیسے بات کرنے سے کچھ کھو جانے کا خدشہ ہو...... آخر پر سیڑھیاں اُترتے ہوئے وریندر شرما کے چہرے کی ساری شکنیں دور ہوئیں...... نیچے اپنے خاندان کو مسکراتے خوش ہوتے دیکھ کر اُسے جہاز کے کرایہ میں اضافہ مناسب ہی لگنے لگا...... وریندر شرما کا دس افراد پر مشتمل خاندان باہر جب ٹیکسیوں میں سوار ہو رہا تھا تو وریندر شرما کے نو سال کے پوتے راجو کی اچانک اُس پر نظر پڑی۔ اُسے دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا...... وہ اُس کے قریب گیا جیسے ہاتھ سے چھو کر دیکھنا چاہتا ہو۔ تبھی ممی کی آواز نے اُسے واپس بلایا۔ وہ تذبذب میں اُسے دیکھتے دیکھتے ٹیکسی میں سوار ہوا...... ہوٹل جاتے ہوئے وہ سب راستے میں دائیں بائیں دور دور تک کھیتوں، سبزہ زاروں، باغوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے تاہم راجو کو وہ ہر جگہ نظر آیا...... ہوٹل پہنچ کر

وہ سب اپنا اپنا سامان لے کر ہنستے مسکراتے ایک دوسرے پر کچھ خاص فقرے کستے ہوئے
کمروں میں داخل ہوئے...... تاہم راجو اُسے وہاں بھی دیکھ کر ٹھٹکا گیا...... اندر آ کر یاد
کرنے لگا...... ٹی وی...... فلم وغیرہ کے کئی منظر ذہن میں آئے۔ لیکن پھر اُلجھ کر رہ گیا ورینڈر
شرما کے خاندان نے دو ہفتے وادی کی خوب سیر کی۔ چند راتیں ڈل جھیل میں ہاؤس بوٹ میں
بھی گذاری...... تاہم اس دوران راجو کو وہ ہر باغ، مندر، سڑک، جھیل کنارے، ہوٹل میں
کہیں نہ کہیں ضرور نظر آیا...... اُسے یاد آیا...... مغل باغات کی سیر کے دوران اُس کی عمر کے
اور بچے بھی اُسے وہاں دیکھ کر کچھ پریشان سے ہوئے تھے...... ایک دو بار پتا جی امیت شرما
سے پوچھنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن انہیں ہر بار دوسروں کے ساتھ فوٹو اور ویڈیو دیکھنے میں
[illegible] مصروف دیکھا۔ ممی سے بھی پوچھا، وہ بھی کچھ سمجھ نہ پائی تھیں...... واپسی پر ایئرپورٹ پہنچ کر وہ پھر
راجو کی نظر میں آیا...... وہ اُسے دیکھتا رہا...... اُس کے بارے میں سوچتے سوچتے دماغ پر
بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہوا...... چند لمحے سوچنے کے بعد اُس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ دادا جی سے
پوچھ ہی لے گا...... وہ بالکل ہی کھڑے دادا جی کے قریب کھڑا ہو گیا...... ورینڈر شرما اُسے
دیکھ کر ہنستے ہوئے بولے۔ "کہو راجو کیسا رہا...... خوب مزے کئے؟"...... "دادا جی، وہ
سب بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ وہ کون ہے؟" راجو نے ایک طرف ہاتھ سے اشارہ
کیا۔ ورینڈر شرما اُدھر دیکھ کر قدرے تذبذب میں پڑ گیا پھر چہرے پر مسکراہٹ کھینچتے ہوئے
...... پیار سے بولا۔ "بیٹا یہ فوجی ہے" [illegible]
[illegible]
☆☆☆
[illegible]

خدا کے ایک شہر میں

ایک زوردار دھماکے کی آواز سے عزبی اپنے چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے ویران کمرے میں جیسے ٹھٹھر کر رہ گئی۔ اس کی اکھڑتی سانس سینے میں ہی ڈوب کے رہ گئی۔ وہ دھک سے پیچھے دیوار سے لگ کر کمزور، بیمار آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ دھماکے کے بعد اٹھنے والے طوفان سے اس کی بوڑھی کمزور ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ بے بسی اور لاچاری کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ آنکھیں بند کر کے خود کو حالات کے حوالے کرنا ہی چاہتی تھی کہ نظریں سامنے دروازے کے درمیان زردے پر پڑیں۔ زرد کتا اسے بظاہر چپ چاپ بڑے سکون سے دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے اس پر دھماکے کا کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو۔ عزبی اسے قدرے غور سے دیکھنے لگی۔ اس کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی تاہم عزبی کو محسوس ہوا اس وقت وہ قدرے بے خوف اور کچھ مطمئن سا ہے۔ عزبی زردے کو برسوں سے جانتی تھی۔ پہلے پہل وہ ایسے موقعوں پر مسلسل بھونکتا رہتا تھا۔ لاشیں دفنانے تک وہ قبرستان کے اردگرد اپنی پوری قوت سے بھونکتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ

دُور دُور سے کتے آ کر اس کا ساتھ نہ دیتے۔ ''آج یہ چُپ کیوں ہے؟'' باہر ابھی طوفان سے پہلے کی سی خاموشی چھائی تھی۔ عزی نے پھر کتے کی طرف دیکھا وہ اسی طرح دروازے کے درمیان اپنی تھوتھنی اگلی ٹانگوں کے درمیان رکھے اسے خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا...... عزّی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ باہر سے ہلکا ہلکا شور اٹھنے لگا۔ عزّی شور سن کر خود کو بھی سمیٹنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ اس کا سانس رکنے لگا۔ باہر شور اب چیخ و پکار میں تبدیل ہونے لگا۔ عزّی نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور کمرے میں بچے اثاثے کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے فوراً اندازہ ہوا اب کمرے میں لٹنے، لوٹنے اور گم ہو جانے کے لئے کچھ بھی نہیں...... سوائے اس کے اپنے۔ یہ سوچتے ہی اسے جیسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے یاس اور بے بسی کے عالم میں اپنی کمزور آنکھیں پوری قوت سے کھولیں اور کمرے کے اردگرد ایسے دیکھنے لگی جیسے کسی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ''یہاں میرا بڑا بیٹا رشید بیٹھتا تھا...... نازّ میری چھوٹی بیٹی۔ ادھر میرے قریب، یہاں بیٹھتی تھی...... اُدھر اس کونے میں نازّ کا باپ عمّہ بستر میں پڑا رہتا تھا...... سب کو گولی لگی...... سب مر گئے...... اب کون ہے میرا...... مجھے اب کس کے مرنے کا خوف ہے۔ آنے دو...... کون آتا ہے''...... اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے اسے اپنا آپ کچھ ہلکا محسوس ہوا...... کچھ خوف بھی کم محسوس ہوا...... اچانک اُس نے کتے کی طرف دیکھا...... وہ بدستور اسے دیکھے جا رہا تھا...... عزّی نے کچھ سمجھ کر اقرار میں سر ہلا دیا، جیسے اس کے خاموش اور مطمئن ہونے کا راز پا لیا ہو۔ باہر سے پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ گولی کی آواز سنتے ہی جیسے عزّی کو کسی غیر مرئی قوت نے کھڑا کیا...... چند لمحے وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ جیسے اپنے آپ اس

طرح کھڑا ہونے کا سبب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے نظریں پھر دروازے کے درمیان بیٹھے کتے پر پڑیں۔ باہر پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ سانس روکے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے جوتوں کی بھیانک چر چراہٹ اسے قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جسے سن کے پہلے اس کا دل دہل کے رہ جاتا تھا۔ آج اس وقت وہ خود کو قدرے بے خوف محسوس کر رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی اس بار اسے کسی عزیز کے مرنے کا کوئی خوف نہیں۔ یہ سوچتے ہی اس کا سارا خون جیسے آنکھوں میں اتر آیا۔

''مجھے کوئی خوف نہیں، کوئی ڈر نہیں......کوئی غم نہیں''۔ خود سے بڑبڑاتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر زرد کتے کو چند لمحے دیکھتی رہی۔ پھر نیچے جھک کر اس کی گردن پر ایک دوبار ہاتھ پھیرا اور پوری قوت سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ کتا اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ تاہم یک لخت اس کے کان کھڑے ہو گئے، جیسے کسی غیر متوقع واقعہ کا منتظر ہو۔

باہر جوتوں کی بھیانک چر چراہٹ اچانک رک گئی۔ چند لمحے سناٹا رہا۔ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ گولی کی آواز سنتے ہی زرد کتا جیسے نیزے پر کھڑا ہو گیا۔ باہر پھر سناٹا چھا گیا۔ اس نے ایک زوردار جھرجھری لی اور سر جھکائے باہر نکل گیا۔ چند لمحے بعد بھونکنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں جیسے کوئی کتا کسی عزیز کے مرنے پر بین کر رہا ہو......اسی دن شام کو ٹیلی ویژن پر اس واقعے کی تفصیل دی گئی۔ تاہم مرنے والے کے لواحقین کے حق میں ایک ایک لاکھ روپیہ بطورِ ریلیف دینے کا بھی اعلان کیا گیا۔ دو دن بعد چند لوگ محلّہ والوں کے ساتھ عزیؔ کے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر کھڑے آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں چند کاغذات کے علاوہ عزیؔ کے نام چیک بھی تھا۔ عزی کا کوئی وارث

نہیں بچا تھا، خاور وہ گرد جمع سبھی لوگ جیکٹ کو للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید جلد ہی ان میں سے
کسی کو عزی کی وراثت ہونے کا پتہ چل جاتا لیکن سوچ رہا تھا، اتنے میں اچانک پچھلی گلی سے زرد کتا
نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا عزی کے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر تن کر کھڑا ہو گیا اور
غور سے سامنے جمع لوگوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظریں جیکٹ پر جم کر رہ گئیں۔ پھر دوسرے ہی
لمحے وہ بڑی مہارت سے آگے کی طرف بڑھا اور ایک ہی جست میں جیکٹ والے آدمی پر جھپٹا
اور جیکٹ منہ میں دبوچ کر برگد کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگ حیرت سے اور کچھ نہ سمجھتے
ہوئے پہلے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر برگد کی طرف دوڑنے لگے۔ برگد کے
بیچوں بیچ زرد کتا جیکٹ کو چیرنے پھاڑنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے دو تین بار یہ عمل دہرایا
پھر جیسے تسلی نہ ہوئی تو جیکٹ کو نکال کر اسے زبان سے چاٹنے لگا۔ پھر بھی جب تسلی نہ ہوئی تو
اسے اگلے پنجوں سے تار تار کیا اور ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر سامنے پڑے ڈسٹ بن میں ڈالتا
گیا۔ پھر ڈسٹ بن کو غور سے دیکھا۔ ارد گرد لوگوں کی طرف دیکھا، ایک جھرجھری لی اور
پرانی مسجد کے ساتھ والے قبرستان کی طرف مڑ گیا جہاں برسوں عزی کو دفنایا گیا تھا۔

یہ شام کیوں نہیں ڈھلتی

آدھی رات کے قریب دروازے پر دستک کی آواز سنتے ہی رزاق نے سہمے ہوئے انداز میں کمرے کی لائٹ آن کی۔ جس کے ساتھ ہی دستک آنا بند ہوئی۔ اس نے دائیں طرف بچوں کی جانب دیکھا۔ عنبرین اور مشتاق کو گہری نیند میں دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا......

تاہم خوف اور وحشت سے وہ کانپ بھی رہا تھا۔ بائیں طرف زینب کی جانب دیکھا۔ وہ اس سے زیادہ خوف زدہ محسوس ہوئی۔ تاہم دونوں نے جیسے ایک خاص سمجھوتے کے تحت آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموشی سے ایک دوسرے کو حوصلہ دیا۔ دونوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں کھلی دیکھ کر تذبذب اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے...... زینب نے آنکھیں بند کیں...... اور اپنی سانس جو اس نے روک رکھی تھی آہستہ آہستہ چھوڑتے ہوئے بولی...... "دروازے پر پھر دستک ہوئی ہے...... اس رات بھی ایسے ہی دستک ہوئی تھی...... مجھے یاد ہے۔" کہتے ہوئے رزاق کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر پھر گیا...... وہ جاوید کو اٹھا کر لے گئے۔ ہم بے بسی سے دیکھتے رہتے...... کہتے ہوئے

زینب کی آواز رندھ گئی......طوفان کا بندھ ٹوٹنے کو تھا کہ رزاق کی آواز نے اُسے ٹوٹنے سے روک دیا......''تم صبر سے کام لو......دستک کی آواز میں نے بھی سنی......اُس رات ہم تیار نہ تھے......آج اگر وہ اندر آئے میں ایک ایک کو کاٹ کے رکھ دوں گا......بس تم ذرا صبر کرو......''اُس رات جاوید بھوکا تھا۔ کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ یاد آتے ہی میرا کلیجہ بیٹھنے لگتا اور تم کہتے ہو......''رزاق کی بات کو کاٹتے ہوئے وہ اپنی بات بھی پوری نہیں کر پائی......عنبرین نے کروٹ بدلی۔ دونوں اُس کی طرف دیکھنے لگے...... پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... رزاق نے پھر بچوں کی طرف دیکھا......اندر ہی اندر کوئی فیصلہ کرتے ہوئے زینب سے مخاطب ہوا۔ تم بچوں کا خیال رکھنا، میں دیکھتا ہوں......'' کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دائیں ہاتھ میں چاقو کو مضبوطی سے پکڑ کر دروازے سے با؛ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔''

صبح سویرے دونوں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے۔ رات کی وحشت اور خوف دونوں کے چہروں سے عیاں تھا۔ بیرونی دروازہ اور یک منزلہ مکان کی ساری کھڑکیاں اور دروازے کھلی دیکھ کر وہ اندر کمروں میں گئے۔ وہاں ہر چیز اپنی جگہ محفوظ دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے......واپس برآمدے میں آئے......اتنی دیر میں چہروں سے رات کی ساری وحشت اور خوف غائب ہو گیا تھا۔ ایک دوسرے کی طرف ایسے دیکھا جیسے ایک مدت کے بعد دیکھ رہے ہوں......زینب نے اپنے اردگرد دیکھا، پھر اندر سے اور مطمئن ہو کر...... کمرے کی طرف بچوں کو جگانے کے لیئے مڑی......رزاق اسے دیکھتا رہا......وہ اسے دیر تک دیکھنا چاہتا تھا......کچھ سوچ کر ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی......وہ اندر

کچن میں گیا، وہاں سے سبزی کے لئے تھیلا اور دودھ کا برتن لے کر اطمینان سے بیرونی دروازے سے باہر بازار کی طرف نکل گیا۔

آدھی رات کو پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ مشتاق نے مشینی انداز میں کمرے کی لائٹ آن کی جس کے ساتھ ہی دستک آنا بند ہوئی۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیوں کو پورا کھلا دیکھ کر اُس نے فوراً زینب اور رزاق کی طرف دیکھا۔ انہیں گہری نیند میں دیکھ کر اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ پھر سامنے بڑی بہن عنبرین کی طرف دیکھا، جو خوف سے سہمی سمٹی اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی "دروازے پر پھر دستک ہوئی......" کہتے ہوئے مشتاق نے جیسے خود کو سمیٹ لیا...... "ہاں......دروازے پر پھر دستک ہوئی......" عنبرین کی زبان سے مشکل سے نکلا...... "کون ہوسکتا ہے......" کہتے ہوئے مشتاق کو اپنا وجود گھٹتا بڑھتا لگ رہا تھا...... "وہ بھی ہو سکتے ہیں...... اگر وہ اندر آگئے...... میں اُٹھ کر دیکھتی ہوں......" عنبرین نے اپنی پوری قوت جیسے اُٹھنے میں لگا دی......لیکن اس کے جسم میں حرکت نہ ہوئی...... "نہیں......" مشتاق کی آواز نے جیسے اُسے دروازے سے واپس کھینچ لیا......وہ ابھی اپنے ہونے نہ ہونے کے تذبذب میں تھی کہ مشتاق نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا...... "تم بیٹھی رہو......میں اُنہیں زندہ واپس نہیں جانے دوں گا بس تم امی ابو کا خیال رکھنا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت کئے بغیر جیسے دروازے سے باہر نکل گیا عنبرین اسے اپنی جگہ دیکھ کر وحشت اور خوف سے اندر ہی اندر بکھر کر رہ گئی۔ اچانک اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگے پرانے وال کلاک پر پڑ گئیں......گھڑی کی سوئیوں کی ہلکی حرکت نے جیسے اُس کے ذہن پر گرم ہتھوڑا مار دیا......وہ پوری قوت سے چلانے لگی......اس کی چیخ نے

مشتاق کے ساکت وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی.... رفیقہ.... تم گھڑی کی طرف دیکھو...... مجھے یاد آ رہا ہے اُس رات بھی یہی وقت تھا...... جب وہ اندر آ گئے...... اور جاوید بھیا کو اپنے ساتھ لے گئے تھے"۔ مشتاق بے یقینی کے عالم میں وال کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ برسوں کی وحشت اور خوف سمٹ کر اُس کے اندر تک اتر گیا۔ اسے اپنا وجود پھر گھٹتا بڑھتا محسوس ہونے لگا۔ سامنے امی، ابو کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر ابھی گہری نیند میں تھے۔ انہیں دیکھ کر اُس پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ چند لمحوں کے لئے جیسے وہ پھر ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ گلے کو اندر ہی اندر صاف کرتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوا۔ "ہاں ...... ہاں...... مجھے بھی یاد ہے...... یہی وقت تھا...... بس تم امی ابو کا خیال رکھنا..... اب آنے دو..... انہیں اس بار میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......" کہتے ہوئے وہ جیسے دروازے کے درمیان ستون کی طرح کھڑا ہو گیا۔ عنبرین امی ابو کے سرہانے خوف اور تذبذب کے درمیان دعائیں مانگنے لگی..... رزاق بظاہر گہری نیند میں تھا۔ اچانک اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ دائیں ہاتھ میں لمبے تیز چاقو پر اُس کی گرفت سخت ہوئی اور وہ دروازے سے باہر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

صبح سویرے دونوں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ رات کے خوف اور وحشت سے اُن کے چہرے بھاری بھاری لگ رہے تھے جیسے برسوں کے بیمار مجبوراً کمروں سے باہر آئے ہوں۔ مکان کا بیرونی دروازہ اور کھڑکیاں کھلی دیکھ کر دونوں اندر کمروں میں گئے۔ وہاں ہر چیز ابھی اپنی جگہ محفوظ دیکھ کر واپس برآمدے میں آ گئے۔ اس دوران رات کی ساری وحشت اور خوف اُن کے چہروں سے غائب ہو چکا تھا۔ اب اُن کے چہرے کھلے کھلے لگ رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف قدرے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

ہم جیت گئے!

جہلم پارک جاتے ہوئے زینت کو راستے میں بچوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ایک دو بار بچوں کو ڈانٹ چکی تھی لیکن بچے اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ بیٹے آصف نے عمر کے سات برس بھی ابھی پورے نہیں کئے تھے۔ ماں کے آگے آگے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح اپنا چھوٹا بلا ہوا میں چھکا مارنے کے انداز میں بار بار گھما گھما کر بہن کو چڑاتا...... جواب میں اس سے عمر میں ایک سال چھوٹی فاطمہ گیند کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں کسی ماہر باؤلر کی طرح گھما پھرا کر اُسے اشاروں سے ہی زیرو پر آوٹ کر کے خوشی سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھتی۔ آصف اس سے کچھ زیادہ ہی چڑ جاتا...... اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بیچ سڑک اُلجھ پڑتے......زینب غصّے اور جھنجھلاہٹ میں دونوں کو ڈانٹ کر الگ کرتی...... ''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اس فتنے کو گھر میں رکھو...... وہاں پارک میں کھیلنے کے لئے بہت چیزیں ہیں مگر تم کہاں ماننے والے تھے۔ اب چپ چاپ چلو...... نہیں تو میں واپس گھر لے جاؤں گی......'' دونوں کچھ دیر خاموشی سے چپ چاپ چلنے کے

بعد پھر اُلجھ پڑتے......زینت کو اس جھلستی گرمی میں رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔آخر اُس نے بچوں کی ضد کے سامنے ہار کیوں مانی۔آنے والے اتوار کو اپنے ابو کے ساتھ جاتے۔میں نے یہ دردِ سر کیوں مول لیا۔ توبہ توبہ......دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد جب اس کا غصہ قدرے کم ہوا تو ساتھ ہی اسے اچانک یاد آیا۔ سویرے جب اُس نے دوسری منزل کے ایک کمرے کی صفائی کے دوران پائین باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی تھی۔ہوا کا ایک لطیف ہلکا جھونکا اسے گدگدا گیا......آگے بڑھ کر کھڑکی سے ذرا باہر جھانکتے ہوئے نیچے دائیں بائیں دور تک نظریں دوڑائیں تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی، سکون تھا، آس پاس دُور دُور تک پیڑ پودے لہلہا رہے تھے۔اُسے یہ سب خواب سا لگا تھا۔''مجھے یہ سب کچھ خواب سا کیوں لگ رہا ہے''؟اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔اسے یاد آیا پچھلے جون کے یہی دن کتنے خوفناک اور ڈراؤنے تھے۔دن میں سو بار جان نکلتی تھی۔ نچلی منزل کی کھڑکیوں کے سارے شیشے ابھی ٹوٹے پڑے ہیں۔ بیرونی دروازے پر گولیوں کے نشان آصف اور فاطمہ کو آج بھی جھگڑنے، بے جا شور شرابا کرنے سے باز رکھ رہے ہیں......کیا کیا نہیں دیکھا۔ یاد آتے ہی اس نے کھڑکی سے قدرے اور باہر جھانکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ پھر اطمینان اور یقین کے ساتھ اپنے آپ سے بڑبڑائی تھی......''لیکن آج حالات بالکل مختلف ہیں، کتنی خاموشی ہے، ہر طرف سکون ہی سکون ہے......جبھی تو بچے کئی دنوں سے جہلم پارک لے جانے کی ضد کر رہے ہیں۔شاید میں بلاوجہ ان سے زیادتی کر رہی ہوں۔ پرسوں رات گئے پتہ نہیں فوزیہ بچوں کے ساتھ کہاں کہاں گھوم کر آئی۔ مجھے بچوں کو جہلم پارک لے جانا چاہیئے۔بچوں کے ساتھ ساتھ میری بھی تفریح

ہو جائے گی۔ امی دور بھی نہیں ہے، شام تک واپس آئیں گے۔ اپنے آپ سے فیصلہ کرتے
ہوئے پیچھے آکر بعد میں سکول سے آتے ہی بچوں کو جہلم پارک جانے کی خوش خبری سنائی تھی
تو دونوں بچوں نے خوشی سے اپنے بھاری بستے کاندھوں سے اس طرح اتار پھینکے تھے جیسے
اب کبھی اٹھانے ہی نہ ہوں...... منٹوں میں تیار ہو کر آصف نے اپنے چھوٹے بلے پر قبضہ
جما لیا اور فاطمہ کے ہاتھ معمول کی طرح گیند آئی تھی، جسے دیکھ کر زینب نے دونوں کو بہت
ڈانٹا تھا...... "اس فتنے کو گھر میں رکھو......" ماں کا جلالی رُخ دیکھ کر دونوں نے بلا اور گیند
ایک طرف رکھ دیئے تھے۔ کچھ دیر بعد جب زینب تیار ہو کر کمرے میں آئی تھی۔ بلا اور گیند
ہاتھوں میں لے کر دونوں اس کے سامنے تیار کھڑے تھے۔ غصے اور جھنجھلاہٹ میں منہ سے
الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے کہ دونوں نے جیسے ایک منصوبہ بند طریقے سے مشترکہ اعلانیہ جاری
کر دیا۔ "امی، ہم آپ کو بالکل بھی تنگ نہیں کریں گے۔" یہ مشترکہ اعلانیہ سن کر زینت کا
سارا غصہ اور جھنجھلاہٹ ایک مسکراہٹ بن کر چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔ اس دوران جہلم
پارک کے ٹکٹ کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر فاطمہ نے ہاتھ کے جھٹکے سے زینب کے خیالوں کا
سلسلہ توڑ دیا۔ زینب نے رُک کر دائیں طرف ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف دیکھا جہاں خواتین کی
قطار میں کچھ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زینب نے ہاتھ کے اشارے سے آصف اور فاطمہ کو ایک
طرف کھڑا رہنے کا اشارہ کیا اور خود قطار میں کھڑی ہوگئی۔ آصف اور فاطمہ دوسرے بچوں کی
طرف دیکھنے لگے جو ٹکٹ لے کر پارک میں داخل ہو رہے تھے۔ زینب کی باری آگئی، اس
نے پیسے دے کر جونہی ٹکٹ ہاتھ میں لیا، آصف نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ٹکٹ
جھٹک لئے اور دوڑ کر گیٹ پر کھڑا ہو گیا...... فاطمہ نے ایک اچٹتی نظر ماں پر ڈالی اور پھدکتی

دوسرے کی طرف دیکھ کر بلا اور گیند ماں کے قریب رکھ دیئے اور قریب ہی Slide کے سامنے دوسرے بچوں میں شامل ہو گئے۔ زینب نے اطمینان کا سانس لیا۔ بلا اور گیند اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے اور خود قدرے ابھری ہوئی جگہ چنار کی چھاؤں کی طرف بڑھ گئی جہاں پہلے ہی اس کی کچھ ہم عمر عورتیں بیٹھی سامنے بچوں کو کھیلتا دیکھ رہی تھی...... دائیں طرف قریب ہی فوجی کو کھڑا دیکھ کر بائیں طرف دوپٹے کا سرا لمبا کھینچ کر آصف اور فاطمہ کی طرف دیکھنے لگی جو دونوں Slide پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف ایک دو بار چڑھنے میں کامیاب رہا تاہم فاطمہ کوشش کرنے کے باوجود بھی ناکام رہی۔ وہ منہ بسورتی ماں کے پاس آئی اور روہانسی آواز میں کہا "میں گھر جاؤں گی، مجھے نہیں کھیلنا یہاں"...... "نہیں میری جان، روتے نہیں"...... کہتے ہوئے زینب نے بیگ سے چپس کا لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا...... "فی الحال تم یہ چپس کھاؤ، بعد میں تمہیں اُدھر swing کے پاس لے جاؤں گی، وہاں زیادہ بچے نہیں ہیں"۔ فاطمہ نے قدرے دوری پر swing کی طرف دیکھا اور مطمئن ہو کر کھانے لگی اور ساتھ ہی آصف کی طرف چڑاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ آصف سے رہا نہ گیا۔ اپنی باری چھوڑ کر دوڑتا ہوا ماں اور فاطمہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ "مجھے بھی دو"۔ آصف نے پیر پٹختے ہوئے کہا۔ زینب نے مسکراتے ہوئے دوسرا لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ آصف بڑی تیزی سے چپس کھانے لگا، بار بار slide کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک اس کی نظریں بائیں طرف اُٹھیں۔ وہاں سے فوجی کہیں جا چکا تھا اور تھوڑی جگہ خالی ہو گئی تھی۔ شاید ڈر کی وجہ سے بچے اس طرف نہیں آئے تھے۔ فاطمہ نے اس دوران پورا لفافہ خالی کر دیا تھا۔ بائیں طرف قدرے کھلی جگہ دیکھ کر ہاتھ پونچھے اور گیند ہاتھ میں اُٹھاتے

ہوئے ماں سے بولی ''امی، اس بار بیٹنگ میں کروں گی''۔ ''کیوں، کل جو ٹاس میں جیتا تب سے میں تھوڑی آؤٹ ہوا تھا، چلو''۔ کہتے ہوئے آصف ماہر کھلاڑی کی طرح میدان کی طرف چل پڑا اور فاطمہ منہ بسورتی ہوئی گیند ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے چل پڑی۔ زینب صرف مسکرا کر رہ گئی اور قریب ہی بیٹھی ایک ہم عمر عورت کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران آصف نے دو چھوٹی کنکریاں لے کر وکٹ کا کام لیا اور ان کے سامنے زمین پر بلا ٹکا کر فاطمہ کی بالنگ کا انتظار کرنے لگا۔ فاطمہ نے اپنی پوری ذہانت دکھا کر بالنگ شروع کی۔ آصف ہر بار ماہر کھلاڑی کی طرح گیند کو زور سے مارتا تاہم ہر بار گیند لڑھک کر وہیں سامنے ہی رک جاتی اور آصف گیند اٹھا کر فاطمہ کی طرف اُچھال دیتا۔ اسی دوران فاطمہ نے جب ایک بار آصف کی طرف گیند پھینکی، اچانک درمیان میں گیند دو بڑے فوجی جوتوں کے ساتھ ٹکرا کر رُک گئی۔ فاطمہ نے نظریں اٹھا کر دیکھا، سامنے فوجی اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آصف کی طرف دیکھا جو فوجی کی آڑ میں بلا زمین سے ٹکا کر گیند کا انتظار کر رہا تھا۔ زینب کو ہم عمر عورت کے ساتھ گفتگو میں مصروف دیکھ کر پھر فوجی کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے گیند کو ہلکی ٹھکر ماری۔ گیند فاطمہ کے پاس آئی۔ اُس نے گیند ہاتھ میں لے لی اور کچھ سوچ کر گیند کو فوجی کے نیچے سے باہر دائیں طرف آصف کی طرف اُچھال دی۔ فوجی نے مسکراتے ہوئے دایاں پاؤں ذرا پھیلا کر گیند کو پھر روک دیا اور مسکراتے ہوئے پھر فاطمہ کی طرف ہلکی ٹھوکر ماری۔ گیند پھر فاطمہ کے سامنے رک گئی۔ فاطمہ نے گیند ہاتھ میں اٹھالی اور آصف کی طرف دیکھا جو جھنجھلاتے ہوئے اسے اشارے سے بائیں طرف گیند پھینکنے کا اشارہ کر رہا تھا اور خود بھی وکٹ چھوڑ کر

فوجی کی آڑ سے ذرا ہٹ کر بائیں طرف بلا ٹکا کر گیند کا انتظار کرنے لگا۔ فاطمہ نے پوری چالاکی سے اپنی جگہ کھڑے کھڑے فوجی کے بائیں طرف سے زور سے گیند آصف کی طرف پھینکی۔ فوجی نے اس بار بھی اپنا بایاں پاؤں ذرا پھیلا کر گیند روکی اور مسکراتے ہوئے پھر ہلکی ٹھوکر ماری۔ گیند لڑھک کر پھر فاطمہ کے سامنے رُک گئی۔ گیند ہاتھ میں لی آصف کی طرف دیکھا جو بہت غصے میں اسے گیند کو فوجی کے اوپر سے پھینکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ بے بسی میں ماں کی طرف دیکھا جو دوسری عورت کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ فوجی کی طرف دیکھا، جو اُسے مسکراتے ہوئے گیند پھینکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ تذبذب اور جھنجلاہٹ میں اسے کچھ سوجھا نہیں، دوڑ کر ماں کے پاس آئی اور پیچھے سے اس کا کندھا ہلا ہلا کر کہنے لگی "امی اس کو ہٹاؤ وہاں سے"۔ زینب نے مڑ کر اسے دیکھا اور پیار سے پوچھا "کس کو؟" ......فاطمہ نے ہاتھ کے اشارے سے فوجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اُس کو" ......زینب نے فوجی کی طرف دیکھا جو اب بھی مسکراتے ہوئے فاطمہ کو دیکھ رہا تھا۔ تذبذب میں زینب کو کچھ سوجھا نہیں کہ کیا کرے۔ پھر فاطمہ کو پیار سے آہستہ سے کہا "کوئی بات نہیں، جاؤ تم کھیلو، وہ وہاں سے ابھی ہٹ جائے گا"۔ زینب پھر گفتگو میں مصروف ہو گئی۔ فاطمہ نے پھر فوجی کی طرف دیکھا جو آصف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قدرے اعتماد سے گیند لے کر اپنی جگہ پر آئی اور پیر زمین پر ٹھہرا کر آصف کو آواز دی: "بھیا!......" آصف جو اس دوران کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے قریب ہی جھولے میں جیسے جھول رہا تھا۔ آواز سن کر فاطمہ کی جانب دیکھنے لگا۔ فاطمہ کے ہاتھوں میں گیند دیکھ کر پھر بلا زمین پر ٹکا کر گیند کا انتظار کرنے لگا۔ فوجی نے مڑ کر آصف کی طرف دیکھا، جو اپنی جگہ بلّے

سے نشان لگا رہا تھا۔فوجی نے مسکراتے ہوئے پھر فاطمہ کی طرف دیکھا، جو قدرے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔اس کی مسکراہٹ پوری ہنسی میں تبدیل ہوگئی۔فاطمہ نے آصف کی طرف کچھ اشارہ کیا اور آنکھیں بند کر کے اپنی پوری قوت سے گیند آصف کی طرف پھینک دی۔پھر یہ سوچ کر آنکھیں کھولیں کہ گیند آصف تک پہنچ گئی ہوگی لیکن اسے اس بار بھی گیند فوجی جوتوں کے درمیان سہمی سہمی نظر آئی۔فوجی نے پھر مسکرا کر گیند کو ہلکی ٹھوکر ماری۔گیند واپس فاطمہ کے قریب آ کر رُک گئی۔گیند ہاتھ میں اٹھائی۔آصف کی طرف دیکھا جو غصے میں اسے شاروں میں نئی ترکیبیں بتا رہا تھا۔ماں کی طرف دیکھا جو گفتگو میں مصروف تھی۔گیند پھینکنے کے لئے ہاتھ اوپر کیا۔پھر جیسے ہاتھ آپ ہی آپ نیچے آ گیا۔دائیں بائیں دیکھا سبھی بچے کھیلوں میں مصروف تھے۔سامنے فوجی کو اپنی طرف مسکراتے دیکھ کر جی میں آیا یہاں سے بھاگ جائے۔پھر پوری طرح ہار کر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں میچتے ہوئے نیچے بیٹھ گئی اور رونا شروع کیا......اسے روتے دیکھ کر آصف نے غصے سے بلا زمین پر دے مارا اور سامنے slide کی طرف متوجہ ہوا۔زینب کے ساتھ گفتگو میں مصروف خاتون نے زینب کو فاطمہ کی طرف اشارہ کیا۔زینب نے مڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا جو زمین پر بیٹھی آنکھیں میچے رو رہی تھی۔گو کہ پارک میں شور کی وجہ سے اس کے رونے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔تاہم اس طرح زمین پر اُسے بیٹھے دیکھ کر زینب دوڑ کر اس کے قریب آ گئی۔اسے اٹھایا، کپڑے جھاڑتے ہوئے پیار سے پوچھا ''میری گڑیا کیوں رو رہی ہے۔آصف نے پھر کچھ کہا'' نہیں وہ وہاں سے ہٹتا نہیں''۔فاطمہ نے آنکھیں بند کئے سر ہلاتے ہوئے زینب کے پیچھے کی طرف اشارہ کیا'' کون''۔کہتے ہوئے زینب نے مڑ کر دیکھا۔'' یہاں تو

کوئی......"۔اس سے پہلے زینب اپنی بات پوری کرتی۔"وہ" فاطمہ نے آنکھیں کھولتے فوجی کی طرف اشارہ کیا۔لیکن وہاں سے فوجی ہٹ چکا تھا۔فاطمہ نے خوشی سے چلاتے ہوئے آصف کو آواز دی۔"ہٹ گیا"......کہتے ہوئے گیند لے کر بالکل اسی جگہ کھڑی ہوگئی جہاں کچھ دیر پہلے فوجی کھڑا تھا اور خوشی سے گیند کو ہاتھ سے اُچھالتے ہوئے آصف کی طرف دیکھتے ہوئے زور زور سے کہنے لگی"ہم جیت گئے"۔زینب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔سہیلی کی طرف دیکھا جو مسکراتے ہوئے ہلا رہی تھی۔زینب پھر بچوں کی طرف دیکھا جو خوشی میں جھومتے ہوئے کہتے جا رہے تھے"ہم جیت گئے،ہم جیت گئے......"بچوں کو اس طرح خوشی سے جھومتے دیکھ کر مسکراتی ہوئی سہیلی کے پاس آ بیٹھی۔فوجی جو قدرے دوری سے بچوں کو دیکھ رہا تھا......جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس دوران آس پاس کے چند اور بچے فاطمہ اور آصف کی آوازیں سن کر اُن کے ساتھ شامل ہو کر ایک دائرے کی شکل میں پوری لئے کے ساتھ تالی بجا بجا کر زور زور سے کہنے لگے"ہم جیت گئے،ہم جیت گئے"......اس دوران ایک دو بار فاطمہ کی نظریں فوجی سے بھی ٹکرائی۔فوجی نے محسوس کیا اب بچی کے چہرے پر خوف کی جگہ کسی اور کیفیت نے لے لی ہے۔جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا......"مجھے وہاں سے ہٹنا نہیں چاہیئے تھا......نہیں،نہیں بچے ہیں،کھیل رہے ہیں۔ابھی تھک کر نکل جائیں گے"۔سوچتے ہوئے اس نے اپنے ہتھیار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لے کر زمین پر قدرے زور سے ٹکا دیا۔زینب اور اس کی سہیلی کے ساتھ ساتھ چنار کی چھاؤں میں بیٹھی دوسری عورتیں اب اپنی اپنی گفتگو بھول کر بچوں کو اس طرح خوشی سے ناچتے دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہی تھیں۔دیکھتے ہی دیکھتے فاطمہ اور آصف کے گرد پارک میں موجود اور بچوں کے ساتھ

ساتھ پارک میں سیر کو آئے کچھ سیاحوں کے بچے بھی شامل ہو گئے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں دور سے تالی بجا کر ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ سب دیکھ کر فوجی تذبذب میں سوچنے لگا۔ ''مجھے وہ جگہ نہیں چھوڑنی چاہیئے تھی......نہیں، نہیں میں نے ایسا کیا کیا۔ بچے ہیں۔ کھیل رہے ہیں......نہیں میرے سے کوئی غلطی ہوئی ہے...... مجھے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں چاہیئے تھا۔ ٹھیک ہے میں اپنی جگہ جا کر پھر کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے کون روکے گا؟ بچے ہیں مجھے دیکھتے ہی بھاگ جائیں گے''۔ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ دائیں بائیں دیکھا، اپنے ہتھیار کو دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے سامنے ناچتے بچوں کو دیکھا اور پورے فوجی انداز میں ان کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بچوں کے قریب پہنچا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ بچے اسے قریب سے دیکھ کر اور شدت سے کہنے لگے......''ہم جیت گئے، ہم جیت گئے''۔ فوجی تذبذب اور قدرے غصے میں فاطمہ اور آصف کو ڈھونڈنے لگا، لیکن اسے محسوس ہوا سارے بچوں کی شکل فاطمہ اور آصف جیسی ہے۔ ہڑ بڑا کر وہ ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر ہتھیار کو اوپر اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر بچوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا بالکل اسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں پہلے ڈیوٹی دے رہا تھا...... دائیں بائیں پارک میں سبھی فوجی کی اس حرکت سے پریشان ہونے کے بجائے اور محظوظ ہوئے، کیوں کہ بچے اب زیادہ ہی شدت کے ساتھ فوجی کے گرد گول دائرے کی شکل میں تالی بجا بجا کر ایک ردم اور لے کے ساتھ گا رہے تھے ''ہم جیت گئے، ہم جیت گئے''۔ بچوں کے بیچ کھڑے فوجی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے ''مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے ڈیوتی دینے سے کون روسکتا ہے؟ ابھی تھک کر

گھر جائیں گے......لیکن میرے یہاں سے ہٹ جانے سے ایسا کیا ہوا، جو یہ اس طرح بے خوف ہو کر......"۔ "انکل یہ لو چپس" کہتے ہوئے ایک بچے نے چپس کا لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کی سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ فوجی نے دائیں بائیں بچوں کی طرف دیکھا۔ بچے خوشی میں جھومتے ہوئے اسے مختلف کھانے کی چیزیں پیش کر رہے تھے۔ "انکل یہ لو چپس"۔ "انکل یہ لو چیونگم"، "انکل یہ لو Apple "......فوجی اپنے ہتھیار کی طرح بے جان و ساکت انہیں صرف دیکھتا رہا۔ اسے اپنا آپ ایک گہرے گرم کنوئیں میں ڈوبتا ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ خوف، تذبذب اور بے یقینی میں وہ اندر ہی اندر پسینے پسینے ہو رہا تھا جو ایک سیلاب بن کر اس کے ہاتھوں تک پہنچا اور اس کا ہتھیار ہاتھ سے خود بخود گر گیا۔ بچوں نے بڑی احتیاط سے ہتھیار اُٹھا کر واپس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بچوں کی یہ حرکت دیکھ کر ساری پارک تالیوں سے گونج اٹھی۔ بہت سے فوٹو بھی لئے گئے۔ زینب جو کافی دیر سے فاطمہ اور آصف پر نظریں ٹکائے دیکھ رہی تھی۔ اب کچھ دیر سے بچوں کی اسی بڑی بھیڑ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اُنہیں دیکھنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اتنے میں پاس ہی ایک مسجد سے مغرب کی اذان بچوں کی آوازوں پر غالب آ گئی۔ اذان کے ساتھ ساتھ تالیوں کی آواز بھی کچھ مدھم پڑ گئی۔ پھر پوری پارک میں عجیب خاموشی چھا گئی۔ سارے بچے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے عزیزوں کے پاس آ گئے۔ فاطمہ اور آصف بھی دوڑ کر ماں کے پاس آئے۔ زینب نے نہ جانے کیا سوچ کر دونوں کو زور سے سینے سے لگایا......اور تینوں پارک میں موجود دوسرے بچوں اور عزیزوں کے ساتھ پارک کے بیرونی گیٹ کی طرف ایک فاتح فوجی کی طرح بڑھنے لگے......فوجی اپنی جگہ کھڑے کھڑے آنکھیں گھما گھما یہ سب دیکھتا

رہا...... جب ساری پارک خالی ہوئی، اس نے قدرے اطمینان سے دائیں بائیں نظریں دوڑائیں، ہر طرف خاموشی اور سکون تھا۔ کہیں سے اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس نے خود کو ہلکا محسوس کرتے ہوئے ہتھیار پر اپنی گرفت نرم کر دی...... آصف کے بلے اور فاطمہ کی گیند پر پڑی...... غصے میں اس کے منہ سے آپ ہی آپ نکل گیا ''یہ کل پھر آئیں گے''...... وہ آگے بڑھا اور بلے اور گیند کے سامنے رک کر انہیں عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ غصے میں اپنا دایاں پاؤں پیچھے کی طرف لے گیا۔ جیسے پوری قوت سے بلے اور گیند کو مارنا چاہتا ہو لیکن اچانک کچھ سوچ کر رُک گیا...... چند لمحے سوچتا رہا...... پھر دایاں پاؤں آہستہ آہستہ آگے لایا اور ہلکے سے پھر گیند کو ٹھوکر ماری اور وہاں سے ہٹ کر پھر اسی جگہ کھڑا ہو گیا، جہاں سے بچوں کو تھوڑی دیر پہلے یہ کہتے ہوئے دیکھ رہا تھا...... ''ہم جیت گئے، ہم جیت گئے''۔

............☆☆☆............

ابابیلیں

پچھلے آٹھ دنوں سے شہر میں جگہ جگہ سنگ باری ''کنہ جنگ'' جاری تھی۔ اس دوران لطیف اور حلیمہ اپنے ۹ سال کے اکلوتے بیٹے آصف کو کسی طرح گھر میں ہی بند رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میاں بیوی دوسرے تمام ضروری کام چھوڑ کر آصف کی تاک میں رہتے۔ اسے دن بھر اپنے ساتھ رکھتے۔ اس دوران آصف نے بھی ہزار ہا جتن کئے کہ وہ باہر گلی کی نکڑ تک پہنچے جہاں سنگ باز مورچہ سنبھالتے تھے۔ لیکن وہ ہر بار ناکام رہا۔ حلیمہ اور لطیف آپس میں مشورہ کرتے رہتے کہ کس طرح وہ آصف کو گلی میں جانے سے باز رکھیں۔ ہر روز اس کی کوئی نہ کوئی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کرتے۔ ایک دن مشورہ کر کے اس کی نئی ماڈل کی سائیکل کی فرمائش بھی پوری کرنے کا وعدہ کیا، جس کے لئے آصف پچھلے کئی مہینوں سے فرمائش کرتا آیا تھا۔ آصف کا دل ان باتوں سے صرف چند ہی لمحوں کے لئے بہل جاتا کیونکہ باہر گلی کی نکڑ سے مسلسل نعرہ بازی اور دوسری آوازیں ان فرمائشوں پر غالب آجاتی۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دوسری منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی جو باہر گلی کی نکڑ کی طرف کھلتی

تھی، کے پاس بیٹھ کر نیچے گلی میں اور لوگوں کے ساتھ ہم عمر بچوں کو آتے جاتے بھاگتے دیکھتا رہتا۔ لطیف اور حلیمہ جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے۔ اس دوران ایک دن سویرے حلیمہ کو محسوس ہوا کہ آصف کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے یاد آیا پچھلے چار پانچ دن سے آصف کی بھوک بھی کم ہوگئی ہے۔ اکثر گم سم اور بجھا بجھا رہتا ہے۔ کتابوں کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ اپنے قریب بلا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ بخار سے تپ رہا تھا۔ اس دوران باہر سے گولیوں کی آواز نے اسے اور خوف زدہ کیا۔ وہ آصف کو لے کر دوسرے کمرے میں داخل ہوئی جہاں لطیف جھنجھلاہٹ اور تذبذب میں پرانی کتابیں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ چند لمحے حلیمہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ اسے لگا لطیف جیسے برسوں سے اسی کمرے میں قید ہے۔ اکثر باہر فائرنگ کی آواز سن کر وہ اس کمرے میں گھس جاتا تھا اور اپنی پرانی کتابیں ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتا تھا۔ یا اللہ...... اگر دو چار دِن اور یہی حالت رہی تو شاید لطیف ذہنی توازن...... نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اس نے اندر ہی اندر خود کو یقین دلانا چاہا لیکن بے یقینی اور تذبذب چہرے پر صاف عیاں تھا۔ لطیف جو چند لمحوں سے دونوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ قدرے جھنجھلائے ہوئے بول پڑا ''کیا بات ہے''۔ ''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بخار سے تپ رہا ہے۔ بھوک بھی نہیں ہے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا۔ اسے ڈاکٹر جاوید کے پاس لے جاؤ، دُور تو نہیں ہے''۔ حلیمہ نے آصف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا...... ''اپنے بارے میں بھی بتادو''۔ حلیمہ نے قدرے فکرمندی سے جملہ پورا کیا...... ''مجھے کیا ہوا ہے'' لطیف نے آصف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اسے بھی کچھ نہیں ہوا۔ یہ بہانے بناتا ہے''۔

اُس روز شام کو ٹی وی سے شہر میں سنگ باری کے دوران ہلاکتوں کے متعلق خبر کو لے کر دونوں میاں بیوی نے آصف کو زبردست تنبیہہ کی کہ وہ کسی صورت بھی گھر سے باہر نہ نکلے۔

آج سنگ باری کا دسواں دن تھا۔آصف سویرے سے ہی کھڑکی سے نیچے گلی میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم عمر بچوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔اسی دوران نکڑ کے آس پاس کہیں گولی کی آواز سے گلی میں زبردست بھگدڑ مچ گئی۔ بچے جوان، سبھی ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔آصف چند لمحہ انہیں دیکھتا رہا پھر جیسے ان کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔وہ سڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے کچن میں آ گیا۔اس کا سانس پھول گیا تھا۔حلیمہ نے اسے سینے سے لگایا۔حلیمہ نے گھبرا کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔لطیف شاید فائرنگ کی آواز سنتے ہی کمرے میں گھس گیا تھا۔اس نے اُسے کئی بار آواز دی لیکن باہر سے نعروں اور دوسری آوازوں میں اس کی آواز جیسے دب کر رہ گئیں۔وہ آصف کو لے کر لطیف کے کمرے میں آ گئی۔لطیف اپنی پرانی کتابیں پھر دوسری جگہ بظاہر بڑے اطمینان سے رکھ رہا تھا۔جیسے اسے کسی اور چیز کا دھیان ہی نہ ہو۔حلیمہ اسے چند لمحے دیکھتی رہی، پھر قدرے احتجاجاً پوچھ بیٹھی ''یہ کیا کر رہے ہو؟''......''کیا کر رہا ہوں کتابیں ترتیب سے رکھ رہا ہوں''۔لطیف نے بغیر دیکھے صفائی دی۔''تم پچھلے دس دنوں سے یہی کر رہے ہو۔اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسے ڈاکٹر جاوید کے پاس لے جاؤ۔نہیں تو میں خود لے جاؤں گی''......حلیمہ نے پھر آصف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔جو باپ کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔''کیا ہوا ہے اسے''......کہتے ہوئے لطیف نے آصف کی طرف دیکھا۔چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔اندر

سے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ بیمار کون ہے؟ ''اب کیا سوچ رہے ہو'' حلیمہ کی آواز نے اس کے فیصلے کو تقویت دی۔ ''ٹھیک ہے''......لطیف نے خود کو اندر سے سمیٹ کر فیصلہ بیٹے کے حق میں کیا...... ''کیا ٹھیک ہے''......حلیمہ نے وضاحت طلب کی۔ آصف کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن...... کہتے کہتے لطیف رُک گیا...... ''لیکن کیا'' حلیمہ کے لہجے میں قدرے غصہ تھا...... میں خود جا کر ڈاکٹر جاوید سے بات کروں گا۔ تم اس کا خیال رکھنا۔ لطیف کے کمرے سے نکلتے ہی آصف کا دماغ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ حلیمہ اسے کچن میں لے آئی۔ پیار سے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا...... ''میرے لال، تم نے سویرے سے کچھ کھایا نہیں۔ آؤ میں تمہارے لئے اچھا قہوہ بناتی ہوں۔ ٹھیک ہے''۔ آصف خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ سوچتے سوچتے اس کے خون کا دباؤ بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ حلیمہ قہوہ بنانے میں مشغول ہو گئی۔ آصف چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر آنگن کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ تیر کی طرح دروازے سے نکل گیا۔

اُدھر لطیف ڈاکٹر جاوید سے مل کر محلے کے اندر ہی ایک کیمسٹ سے دوائیں لے کر واپس لوٹا۔ بھگدڑ سے وہ ایک گلی سے دوسری گلی میں آ نکلتا۔ دوڑنے بھاگنے کے دوران اسے اپنا گھر، جو دوسری گلی میں تھا، کوسوں دور نظر آنے لگا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ ''میں نے مکان یہاں لیا ہی کیوں......حلیمہ کو لگ رہا ہے میں پاگل ہوں......نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں صرف کتابیں ترتیب سے رکھتا ہوں۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی میں کچھ نہ کچھ کروں گا۔ کیا کروں گا؟ آصف واقعی بیمار ہے یا باہر جانے کے لئے

بہانے بناتا ہے؟ ڈاکٹر جاوید کہہ رہا تھا ان حالات میں ایسا ہوتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ گولیوں کی آواز سنتے ہی آدمی کمرے میں گھس کر بار بار کتابیں ترتیب سے رکھتا ہے۔'' انہی خیالات میں غرق بڑی مشکل سے گرتا پڑتا لطیف گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اسے محسوس ہوا منٹوں کا فاصلہ اُس نے گھنٹوں میں طے کیا۔ قدرے اطمینان کا سانس لے کر اس نے جونہی دروازہ کھولا سامنے حلیمہ کو بُت کی طرح کھڑا دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گیا اور پوری شدت سے چلّایا ''آصف کہاں ہے؟'' ''نکل گیا''...... حلیمہ کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی...... ''نکل گیا''۔ لطیف خود سے دہراتے ہوئے بے بسی سے اِدھر اُدھر کہیں دیکھنے لگا۔ دوائیوں کا لفافہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ حلیمہ کی طرف دیکھا پھر واپس دروازے کی طرف مڑ گیا۔ آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ حلیمہ دوڑتی ہوئی آئی اور لطیف کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ''تم مت جاؤ...... وہ دوسر بچوں کے ساتھ اِدھر اُدھر کہیں ہوگا۔ بس آتا ہی ہوگا''۔ کہتے ہوئے اس کی آواز رُندھ گئی۔ ''نہیں...... سبھی واپس نہیں آتے...... مجھے جانے دو''۔ کہتے ہوئے لطیف دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر دروازہ کھولنا ہی چاہا کہ باہر سے کرفیو کا اعلان ہو رہا تھا۔ وہ وہیں جیسے اکڑ کے رہ گیا۔ ''آصف اب نہیں آئے گا۔ تم ابھی کہتے تھے سبھی واپس نہیں آتے''۔ کہتے ہوئے حلیمہ بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے کسی غیبی مدد کی اُمید ہو...... لطیف تذبذب اور کشمکش میں ابھی فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں آصف ہانپتا ہوا دروازے سے داخل ہو کر ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حلیمہ کو یقین ہی نہیں آیا۔ وہ اُسے زور سے سینے سے لگا کر ''میرے لال، تم کہاں گئے تھے۔ میرا تو دم ہی نکل گیا تھا''۔ کہتے ہوئے لطیف کی طرف دیکھنے لگی۔ جواب قدرے سنبھل کر

آصف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ کوئی من پسند کھیل کھیل کر آیا ہو۔ ہانپنے کے باوجود بھی اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ ''یہ سب کیسے ہوا''۔ اپنے آپ سے دوہراتے ہوئے قدرے تذبذب میں آگے بڑھ کر وہ آصف کو بری طرح مارنے اور کوسنے لگا۔ ''تم باہر گئے ہی کیوں...... تم بیمار نہیں تھے۔ تم بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا''۔ اس دوران حلیمہ آصف کو بچاتے بچاتے اندر کمرے میں لے گئی۔ باہر سے پھر فائرنگ کی آوازیں آئیں۔ لطیف نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے کمرے میں گھس گیا۔

سہ پہر کو حلیمہ دوسری منزل کے کمرے میں آصف کو کھڑکی کے بجائے بیڈ پر آرام سے لیٹے دیکھ کر قدرے شش و پنج میں پڑ گئی۔ قریب آ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر غور سے اس کے چہرے کو دیکھا جو پوری طرح کھلا ہوا لگ رہا تھا۔ پوچھا، بیٹا اب کیسی طبیعت ہے۔ اب بخار تو نہیں ہے''۔ ''نہیں امی مجھے بخار کب تھا۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں'' آصف نے اطمینان سے جواب دیا۔ حلیمہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر سمجھانے لگی...... ''بیٹا اب خدا کے لئے ہرگز باہر نہیں نکلنا۔ تمہیں اپنے ابو کے غصّے کا تو پتہ ہے۔ آج تمہاری وجہ سے مجھے بھی پتہ نہیں کیا کیا سننا پڑا۔ اتنا منع کرنے کے باوجود بھی تم باہر نکلے۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی تھی''۔

''میں نے کسی کو پتھر نہیں مارا''...... آصف نے معصومیت سے صفائی دی۔ ''پتھر نہیں مارا۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی''۔ حلیمہ نے قدرے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ آصف نے تکیہ کے نیچے سے ایک چھوٹا پتھر نکالا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ حلیمہ قدرے تذبذب میں کبھی آصف اور کبھی پتھر کو دیکھنے لگی۔ پھر اسی لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا ہے''؟ پتھر...... آصف

نے اسی معصومیت سے جواب دیا۔''اسے یہاں کیوں لائے ہو۔ دو مجھے، میں اسے باہر پھینک دوں گی''۔حلیمہ نے قدرے تیز لہجے میں کہا''نہیں امی یہ معمولی پتھر نہیں ہے''۔ ''اچھا'' حلیمہ نے قدرے تذبذب میں پوچھا......''ہاں! امی جب میں نکڑ پر سنگ باری ''کنہ جنگ'' دیکھ رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں اچانک مجھے کیا ہوگیا۔ میں اِدھر اُدھر پتھر ڈھونڈ نے لگا۔ میری نظر اس چھوٹے سے پتھر پر پڑی......لیکن......'' کہتے ہوئے آصف رک گیا، جیسے کوئی راز کی بات کہنے والا ہو......''لیکن کیا؟'' حلیمہ ابھی تذبذب میں تھی......''وہ امی میں نے جونہی یہ چھوٹا پتھر ہاتھ میں لیا۔ اسی وقت فوج آگئی اور کرفیو لگ گیا۔ میں دوڑتے دوڑتے گھر آگیا تاکہ ابو سے پوچھوں میرے پتھر اٹھاتے ہی فوج کیوں آگئی اور کرفیو کیوں لگ گیا؟ لیکن ابو نے پوچھنے کا موقعہ ہی نہیں دیا......آپ کو معلوم ہے؟''......''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ پتہ نہیں کیا اناپ شناپ بک رہا ہے۔ دے یہ پتھر مجھے......حلیمہ نے قدرے تُرش لہجے میں کہا''......''نہیں امی......آپ کو ایک اور بات بتانی ہے......آپ کو پتہ ہے''؟......''کیا''......حلیمہ نے پوری برہمی اور جھنجھلاہٹ سے پوچھا......''میں نے خواب میں ابابیلیں دیکھیں''۔ کہتے ہوئے آصف نے پتھر تکیہ کے نیچے رکھ دیا اور اطمینان سے کروٹ بدلی۔

............☆☆☆............

احتیاط

تقریباً دو مہینے کی لگاتار دن رات کی محنت کے بعد شہرِ خاص میں کھیل کا ایک بڑا میدان اب مکمل ہونے کے آخری مراحل میں تھا۔ چند روز میں میدان کے چاروں طرف تماشائیوں کے لئے کرسیوں کو قرینے سے سجایا گیا۔ ساتھ ہی میدان کے دائیں طرف درمیان میں ایک خوبصورت سٹیج بھی تیار ہوا جس کے دائیں بائیں اور پیچھے سو کے قریب قیمتی صوفہ سیٹ میدان کی خوبصورتی میں اور اضافہ کر رہے تھے۔ ان تیاریوں کے دوران اطراف میں کھیل کے میدان کے متعلق دُور دُور تک چرچے شروع ہوگئے۔ ہر کوئی اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا رہا۔ تاہم علاقے کے نوجوان جیسے سب کچھ بھول کر آئندہ مختلف کھیلوں میں نمایاں کارگردگی دکھانے کے خواب دیکھنے لگے......ساتھ ہی یہ خبر بھی دُور دُور تک پھیل گئی کہ کھیل کے میدان کا افتتاح علاقے کی دو بہترین فٹ بال ٹیموں کے درمیان میچ سے ہوگا......دوسرے دن اخبار میں خبر آئی کہ ۱۰ جون کو شہرِ خاص میں نئے آزاد سپورٹس سٹیڈیم کا افتتاح وزیرِ کھیل کے ہاتھوں ہوگا جو افتتاحی میچ کھیلنے والی ٹیموں میں انعامات بھی تقسیم کریں

گے......اُسی شام مختلف ایجنسیوں کو ہدایت دی گئی کہ دس جون کو افتتاحی میچ سے قبل تمام احتیاطی تدبیریں اختیار کی جائیں تاکہ میچ کے دوران کسی قسم کی بدامنی کا ذرہ بھی خدشہ نہ رہے...... ہدایت پاتے ہی مختلف ایجنسیاں حرکت میں آگئیں......۱۰ جون کو آس پاس کے سارے علاقوں کے گلی کوچوں میں ہفتوں سے جمع کوڑا کرکٹ کو صاف کیا گیا۔کھیل کے میدان کی طرف جانے والے تمام گلی کوچوں اور دیواروں کو چونے سے پوت دیا گیا...... کچھ دیر بعد کھیل کے میدان کے منتظمین میدان کے داخلی گیٹ پر آنے والوں کا مسکراتے استقبال کرنے میں مصروف ہو گئے۔ جس کے دوران وہ قدرے تذبذب میں رہے۔اس دوران منسٹر صاحب ایک کارواں کی صورت میں میدان میں داخل ہوئے اور اپنی مخصوص جگہ پر تشریف فرما ہوئے......سب کی نگاہیں سامنے خالی میدان کی طرف مرکوز ہوئیں...... سبھی منتظر تھے کہ ٹیمیں اب اُتری کہ اب اُتری......لیکن منسٹر صاحب کے سامنے کھیل کا میدان ویران ہی رہا...... چند منٹ بعد منسٹر صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ پھر قدرے جھنجھلاتے ہوئے ساتھ ہی بیٹھے ایک آفیسر سے پوچھا......"ٹیمیں کہاں ہیں......میچ کب شروع ہوگا......میرا شیڈول بہت ٹائٹ ہے۔آپ کو معلوم ہے......" سنتے ہی آفیسر نے سر جھکا لیا اور پیچھے مڑ کر ایک اور آفیسر سے پوچھا...... پوچھتے پوچھتے بات ایجنسی کے اعلیٰ آفیسر تک پہنچی......جس کا جواب منسٹر کو قدرے معذرت کے ساتھ گوش گزار کیا گیا...... "کہ جناب اس علاقے کے تمام نوجوانوں کو احتیاطاً...... پہلے ہی حراست میں لیا گیا ہے......!!!"

............☆☆☆............

خواب، قید اور تماشائی

فیکٹری کے مین گیٹ سے باہر آتے ہی مجھ پر پھر وہی خوف، تذبذب اور بے چینی کی کیفیت طاری ہوئی۔ کچھ جھنجھلاتے ہوئے میں نے سڑک پار کی اور دوسری جانب دوپہر کی تیز دھوپ میں گاڑی کا انتظار کرنے لگا...... چند لمحے بعد گاڑی دائیں جانب سے آتی دکھائی دی۔ میں خالی خالی نظروں سے گاڑی کو دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچنے لگا...... جو کبھی کبھی اچانک کہیں اندر سے عود کر میرے سارے وجود کو منتشر کر کے رکھ دیتی ہے...... مجھے یاد آیا آج سویرے گھر سے نکلتے وقت سے ہی مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی......اور گھر سے مین روڈ تک آتے آتے میں رات گئے تک واقعات کے متعلق سوچتا رہا...... بظاہر کوئی ایسی انہونی بات نہ ہوئی سوائے اس کے کہ عشاء کی اذان کے وقت بیوی نے ٹی وی کا والیوم کم کرنے کو کہا تھا...... جو میں نے فوراً کیا......لیکن یاد نہیں آرہا تھا کہ پھر میں نے عشاء کی نماز پڑھی کہ نہیں ......سویرے بیوی نے ایک عجیب غریب خواب کا ذکر کیا ...... جو اس نے رات کو دیکھا تھا......اور جس میں بے تعلق سے ایسے

واقعات کا ذکر تھا......جن سے مجھے اندر ہی اندر خوف سا محسوس ہوا......وہ خواب سنا رہی تھی......میں نے توجہ فیض کی طرف دی......جو ماں کو غور سے دیکھ رہا تھا......میں نے اس کی طرف بالکل توجہ نہ دی......یا......شاید دی بھی ہو......کچھ یاد نہیں آ رہا......ٹھیک ہے......شاید اس کے بعد ہی مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی......تذبذب میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا......کہ گاڑی قریب آ کے رُک گئی......ایک سواری گاڑی سے اتری......میں گاڑی میں سوار ہوا......گاڑی پھر چل پڑی۔میں پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہوا دائیں طرف ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا......کنڈکٹر کو کرایہ دیا......اور قدرے اطمینان سے اپنی کیفیت پر سوچنے لگا......پھر جھنجھلاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا......بیسیوں بار تنہائی میں بیٹھ کر اس پر غور کر چکا ہوں......کھڑکی سے باہر منظر تیزی سے بدل رہا تھا......لیکن میرے اندر کا منظر کب کا منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔میری بائیں جانب ایک خاتون اپنے بچے کو گود میں لے کر آنکھوں میں خوبصورت منظر ترتیب دے رہی تھی۔اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا......نہ جانے کیوں مجھے فیض کی یاد شدت سے آئی......میں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا......میں نے آنکھیں بند کر لیں......کچھ دیر بعد گاڑی اگلے سٹاپ پر رک گئی......آنکھیں کھولی......گاڑی شہر کے وسط میں نئی پارک کے سامنے کھڑی تھی......کچھ سواریاں اُترنے لگیں......میری دائیں جانب خاتون بھی بچے کو گود میں اُٹھا کر اتر گئی......میں نے پارک کی جانب دیکھا......تقریباً چھ فٹ اونچی جالی کے اندر کا منظر میرے اندر کے منظر سے بہت مختلف تھا۔وسیع پارک میں لوگ ٹولیوں کی صورت میں قدرے بےفکر اور خوش وخرم گھوم پھر رہے تھے......جالی کے ساتھ ساتھ قدرے تنہائی میں کچھ جوان جوڑے

منظر کو اور خوبصورت بنانے میں محو تھے۔ ساتھ ہی ایک طرف چھوٹے سے تالاب میں بچے نہا رہے تھے۔ مجھے پھر فیض کی یاد آتی۔ چند لمحوں کے لئے جیسے میرا سارا تذبذب اور بے چینی غائب ہوئی...... کیوں نہ میں بھی چند لمحے پارک میں گزار آؤں ......اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا......اگلی بار میں فہمیدہ اور فیض کو ضرور ساتھ لے آؤں گا'' اپنے آپ سے یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں بھی گاڑی سے نیچے اُترا اور پارک کی دوسری طرف میں گیٹ کی جانب بڑھنے لگا......مین گیٹ کے قریب پہنچا تو وہاں ٹکٹ کاؤنٹر کے سامنے لمبی لائن دیکھ کر کچھ مایوس ہوا......نظریں پھر پارک کے اندر کے منظر سے دوچار ہوئیں......اندر منظر واقعی خوبصورت اور دل کو لبھانے والا تھا......میں لائین میں کھڑا ہو گیا......اور چند لمحے اطمینان سے لائن میں کھڑا رہا لیکن ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا ...... چند لمحے پھر بھی کھڑا رہا...... پھر کچھ اُکتا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا......نظر آگے ٹکٹ کاؤنٹر کی جانب بھیڑ پر پڑی جسے دیکھ کر میری اُکتاہٹ غصے میں تبدیل ہوئی۔ میں کسی صورت چند لمحے پارک کے اندر گزارنا چاہتا تھا......لیکن......نظریں پارک کے سامنے سڑک کے پار تماشہ گاہ پر پڑیں...... مجھے یاد آیا ......وہاں ایک عرصے سے ایک کھیل کھیلا جا رہا تھا......لیکن مجھے کبھی وقت نہیں ملا......تماشہ گاہ کے مین گیٹ پر کوئی بھیڑ نہ تھی...... میں نے گھڑی کی طرف دیکھا......ابھی سہ پہر کے تین ہی بجے تھے......ممکن ہے وہاں بھی پارک کے اندر جیسا ہی کھیل ہو...... کیوں نہ میں فی الحال کھیل دیکھ آؤں اور پھر پارک کے اندر جا کر چند لمحے ستا لوں ......سوچتے ہوئے میں نے سڑک پار کی اور تماشہ گاہ کے مین گیٹ کے قریب پہنچتے ہی گیٹ کے دائیں طرف سے ایک اَدھیڑ عمر کا آدمی اچانک نکل کر میرے

قریب آیا......اُس نے کھیل کا ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور تیزی سے واپس گیٹ کے عقب میں جیسے غائب ہو گیا......اسے دیکھ کر مجھے رہ رہ کر یاد آنے لگا......کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔وہ میرا جانا پہچانا ہے،اسی لئے اُس نے مجھ سے ٹکٹ کے پیسے نہیں لئے۔لیکن تھا کون......ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا......میں ٹکٹ لے کر تماشہ گاہ کے ہال کے مرکزی دروازے پر پہنچا......دروازے کے ساتھ جو آدمی ہال کے اندر کی طرف کھڑا تھا، میں نے اس کے ہاتھ میں ٹکٹ تھما دیا لیکن ساتھ ہی محسوس ہوا......یہ وہی آدمی ہے جس نے باہر گیٹ پر میرے ہاتھ میں کھیل کا ٹکٹ تھما دیا تھا......اس دوران میں دو تین قدم ہال کے اندر آیا تھا...... پیچھے مڑ کر دیکھا......اُس نے شاید دروازہ بند کیا تھا......اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ہال کی طرف گھوم کر دیکھا۔نیم مدھم روشنی میں کچھ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔دائیں بائیں راستہ ٹٹولتا ہوا مشکل سے بائیں طرف ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا چند لمحے اسی طرح بیٹھا رہا پھر جب آنکھیں ہال کی مدھم روشنی سے کچھ مانوس ہوئیں تو غور سے دیکھا۔تقریباً ایک تہائی ہال تماشائیوں سے بھرا تھا......آگے سٹیج پر سرخ رنگ کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔سارے تماشائی بظاہر اُسی طرف دیکھ رہے تھے کہ کب پردہ اُٹھے اور کھیل شروع ہو......میں بھی چپ چاپ بیٹھا رہا......لیکن پارک کا منظر رہ رہ کر یاد آ رہا تھا...... چند لمحے اسی طرح گزرے کہ اچانک سٹیج کے دائیں بائیں سپیکروں سے پہلے شور کے ساتھ عجیب سی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔پھر جیسے کوئی زور سے ہال میں موجود تماشائیوں سے مخاطب ہوا۔کوشش کے باوجود بھی میں کچھ نہ سمجھ کا۔شاید کھیل دیر سے شروع ہونے پر معذرت کا اظہار کیا جا رہا تھا یا کچھ اور......میں کچھ نہ سمجھ سکا۔سپیکر خاموش ہو گئے۔میں سرخ پردے کی

طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا کہ بس اب پردہ اُٹھے گا اور کھیل شروع ہوگا۔ کچھ نہ ہوا......
مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا......گھڑی کی طرف دیکھا......کچھ اندازہ نہ کر سکا......دائیں
بائیں دیکھا تو تماشائی اب بھی خاموشی سے آگے سرخ پردے کی طرف دیکھ رہے
تھے......اچانک میرے آگے سے دو تماشائی اپنی سیٹوں سے اُٹھے اور میرے قریب سے
گزر کر عقب میں چلے گئے جہاں سے میں اندر ہال میں داخل ہوا تھا۔ میں اُدھر دیکھتا رہا اور
دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جیسے اندھیرے میں غائب سے ہو گئے۔ دروازہ نہ کھلا
کچھ دیر بعد وہ واپس آئے اور میرے قریب کھڑے ہو گئے اور اشاروں میں ایک دوسرے کو
کچھ سمجھانے لگے۔ پھر اُن میں سے ایک ہال کے بیچوں بیچ راستہ کی طرف مڑ کر آگے بڑھنے
لگا، دوسرا بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ وہ دونوں سٹیج کے قریب پہنچ کر دائیں
طرف ایک قدرے چھوٹے سے دروازے سے باہر نکل گئے۔ میں نے بے یقینی اور
تذبذب میں پھر سٹیج پر لٹکے سرخ پردے کی طرف دیکھا جو مجھے اب ایک سرخ کنکریٹ دیوار
کی طرح لگ رہا تھا...... ہال میں لوگ اب بھی چپ تھے کہیں سے بھی کسی طرح کا احتجاج یا
کسی قسم کی سرگوشی نہیں ہو رہی تھی جس سے مجھے وحشت سی ہوئی ......میں نے ہمت کر کے
پھر اپنے دائیں بائیں بیٹھے تماشائیوں کی طرف دیکھا۔ بظاہر لوگ ہی تھے لیکن جیسے اُن میں
جان نہیں تھی۔ جیسے کسی نے لاشیں بڑے قرینے سے کرسیوں پر سجا رکھی تھیں......میں
ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور عقب میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اندھیرے
میں دیوار کو دور تک ٹٹولا......وہاں جیسے دروازہ تھا ہی نہیں ۔ واپس مڑا تو سٹیج کی دائیں
طرف قدرے چھوٹے سے دروازے پر نظر پڑی جہاں سے کچھ دیر پہلے دو تماشائی باہر نکل

گئے تھے۔ میں خود کو کوستا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر چھوٹے سے دروازے سے باہر نکل گیا...... لیکن یہاں کا منظر اندر کے منظر سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہی نیم روشنی، دائیں طرف تھوڑی دوری پر ایک اور دروازہ تھا جس پر سرخ رنگ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ شاید یہاں سے باہر جانے کا راستہ ہو...... قریب پہنچ کر پردہ ہٹایا...... دروازہ نہ تھا، وہ دیوار تھی...... وہ تماشائی کدھر سے باہر نکلے...... نکلے بھی یا......؟ میں واپس چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے جیسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی...... میں آواز کی طرف تقریباً دوڑ پڑا...... جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا آواز بھی دور ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اس دوران میں ایک سیڑھی بھی چڑھ آیا تھا...... اور اب میں شاید دوسری منزل میں تھا۔ آواز اب بھی آ رہی تھی...... میں پوری توجہ سے آواز سننے لگا...... مجھے محسوس ہوا جیسے یہ آواز دروازہ کھلنے کی نہ ہو بلکہ کسی چیز کے گھسیٹنے کی آواز ہو۔ مدھم روشنی میں دائیں طرف ایک بڑے شیشے پر نظر پڑی...... قریب گیا اور شیشے کے دوسری طرف دیکھنے لگا...... کچھ دیر بعد کچھ کچھ دکھائی دیا...... اندر ایک وسیع کمرے میں سٹریچر پر دو تماشائی جیسے لیٹے تھے اور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی...... شاید وہی جس نے مجھے ٹکٹ دیا تھا اور شاید بعد میں واپس بھی لیا تھا۔ وہ اسٹریچر کو گھسیٹ کر دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ میں شیشے کو زور زور سے پیٹتا رہا اور ساتھ ہی اسے آواز بھی دیتا رہا...... تاکہ میری طرف متوجہ ہو...... میری آوازوں اور شیشہ پیٹنے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا...... پھر شیشے کی دوسری طرف دیکھا وہ اسٹریچر کو تقریباً کمرے کے دوسرے کونے تک گھسیٹتے ہوئے پہنچ گیا تھا۔ دونوں تماشائی بے سُدھ اسٹریچر پر پڑے تھے۔ وہ اچانک رُک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے معلوم نہیں میں کہاں پر ہوں...... اُس

کے چہرے پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی......جسے دیکھ کر میں اور خوفزدہ ہوگیا۔ وہ اسٹریچر کو گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گیا......میں نے مشکل سے خود پر قابو پالیا اور شروع سے گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگا......ٹکٹ ،کھیل، ہال، پردہ، تماشائی اب یہ سب ...... یہ سب ...... مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہا تھا......جتنی جلدی ممکن ہو سکے مجھے باہر کا راستہ تلاش کر کے یہاں سے نکل جانا چاہیئے......نہیں تو میرا حال بھی ...... دو تماشائیوں ، یا حال میں موجود لاشوں جیسا ہوگا......نہیں میں کسی صورت یہاں سے نکل جاؤں گا'' ......میں پاگلوں کی طرح واپس پہلے دروازے کی طرف دوڑا......مشکل سے وہاں پہنچا۔ شاید یہی دروازہ تھا......دروازہ کھولا ......اندر داخل ہوا......اندر پھر منظر مختلف تھا۔ نیچے کی طرف ایک پختہ سیڑھی جا رہی تھی۔ جسکے آخر پر تیز روشنی نظر آ رہی تھی۔ شاید یہیں سے باہر جانے کا راستہ ہو......میں جلدی سے سیڑھیاں اُترا......آخر پر محسوس ہوا روشنی کہیں اور سے آ رہی ہے۔ بائیں جانب اوپر کی طرف دیکھا ایک سیڑھی اوپر کی طرف جا رہی تھی جس کے آخر پر تیز روشنی نظر آ رہی تھی......شاید وہاں سے باہر جانے کا کوئی راستہ ہو......میں تیزی سے یہ سیڑھی بھی چڑھ گیا......اور......آج برسوں سے میں انہی بھول بھلیوں میں پھنسا باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں......جو مجھے ابھی تک نہیں ملا......۔

............☆☆☆............

خوابیدہ گھونگھٹ

آج ۲۴ مارچ ہے۔ ہماری شادی کی تیسری سالگرہ۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیئے تھا۔ میں اُداس کیوں ہوں......؟ عالیشان بنگلہ، نوکر چاکر، دھن دولت ، پڑھی لکھی خوبصورت بیوی......سب کچھ ہوتے ہوئے بھی جیسے میرے پاس کچھ نہیں...... یہ بناوٹ ہے، فریب ہے، جل ہے......پھر......پھر حقیقت کیا ہے......؟......وہ بیرونی گیٹ کے دائیں طرف ایک خستہ جھونپڑی...... جہاں نہ نوکر ہے، نہ چاکر ہے، نہ دھن ہے نہ دولت ہے...... جہاں حقیقت ہے......سکون سے پُر ایک خوشگوار زندگی ہے...... جہاں مالی اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہے......اُن کی شادی بھی تو آج ہی ہوئی تھی...... ہاں ٹھیک تین سال پہلے اسی دن ۲۴ مارچ کو......!

میں جب بھی اُداس ہوتا ہوں، میرے قدم اُسی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں......جس کی گرد آلودہ دیواروں میں میرا ماضی دفن ہے......آج میں بہت اُداس ہوں......اس لئے میرے قدم اُس جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے......میں جوں جوں

جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ماضی کا بپھرا ہوا سمندر مجھے نگلنے کے لئے بے قرار ہے......آج میں ماضی میں کھو جانے کے لئے تیار ہوں......کیونکہ آج میں بہت اُداس ہوں......اچانک ایک تندو تیز لہر نے مجھے ماضی کے بپھرے ہوئے سمندر میں ڈبو دیا......اور میں پیچھے بہت پیچھے چلا گیا......

اُن دنوں میری پوسٹنگ دہلی میں ہوئی تھی......پہلے پہل میں دہلی کے نئے ماحول، نئے لوگوں اور خاص کر گرمی کی حدّت سے کُچھ اکتا سا گیا تھا......لیکن چند ہی دنوں میں مجھے ایک ساتھی مِل گیا......اور میں اس نئے ماحول سے مانوس سا ہو گیا...... یہ نیا ساتھی جس سے میں نے کبھی بات تک نہ کی......جس کا نام تک نہ جانا......جس نے میری طرف کبھی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا......اُسے دیکھ کر میرے دل میں ایک غیر معمولی ہمدردی پیدا ہوتی تھی......میں ہر روز تصوّر میں اس کا ہمدرد بن کر اُس سے باتیں کیا کرتا تھا......ہاں وہ بڑے پُل کے اس پار بائیں طرف فٹ پاتھ پر اپنے مستقبل کا دھندلا مگر زنگ آلودہ عکس دیکھتی رہتی تھی......لیکن ہر آنے والا قریب پہنچ کر پھٹے ہوئے دوپٹے پر ایک سکہ پھینکتا ہوا چلا جاتا تھا......میں نے اُس کے پھٹے ہوئے دوپٹے پر کبھی سکہ نہیں پھینکا......وہ بھکارن تھی......لیکن میرے دل نے اُسے کبھی بھکارن کے روپ میں نہیں دیکھا......بڑی بڑی کالی آنکھیں جن کی خاموشی ساگر کی طرح اپنے اندر نہ جانے کتنے طوفان چُھپائے تھی......مُرجھایا ہوا معصُوم چہرہ......حالات کی بھٹی میں تپ کر پت جھڑ کے پتے کی طرح سوکھ چکا تھا......

......وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ درد بھی بڑھتا گیا......ایک کسک تھی......ایک

چُبھن تھی......ایک تصور تھا...... جو بھکارن کا لبادہ اوڑھ کر کبھی ہمدردی کی بھیک مانگا کرتا تھا......اور کبھی افلاس کا لبادہ پھینک کر میرے دل و دماغ پر مُسلط ہو جاتا تھا......آخر دو سال کے طویل عرصے کے بعد میری پوسٹنگ واپس سرینگر ہوئی......لیکن میں اُس بھکارن کی کسک، درد اور چبھن کو بُھلا نہ سکا۔ جس تصور درد اور چبھن کے سہارے میں نے دو سال کا طویل عرصہ ایسے گزارا جیسے میرے ساتھ میرا کوئی ہمدرد تھا......ہم زبان تھا......ہم خیال تھا......!

آخر میں نے اُس بھکارن کو اپنے ساتھ سرینگر لے جانے کا فیصلہ کر لیا......اُس نے میرے ساتھ آنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ جب میں نے اُس سے یہ کہہ کر اپنے ساتھ آنے کو کہا کہ ''ہمارے گھر میں ایک مُلازمہ کی ضرورت ہے۔ اگر مناسب سمجھو''...... !اس سے پہلے میں کچھ اور کہتا اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں میرا بغور جائزہ لینے لگیں۔ جیسے جو کچھ میں نے کہا تھا اُس کا پسِ منظر میری آنکھوں میں دیکھنا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھیں پتہ نہیں کتنی دیر تک کھلی رہیں۔ وہ مجھے بت بنی تکتی رہی......ہاں وہ ۲۴ مارچ کی ایک شام تھی...... جب عبدلؔ میرا سب کچھ لوٹ لے گیا......میں کچھ کہہ نہ سکا...... نجمہؔ خوش تھی۔ نجمہؔ کو اپنے وجود کا احساس ہو گیا تھا......اُنہوں نے اپنی چھوٹی سی دنیا باغ کے بیرونی گیٹ کے دائیں طرف ایک جھونپڑی میں آباد کر لی......!

......آج ۲۴ مارچ ہے۔ اور میں بہت اُداس ہوں......اس لیئے میرے قدم اُس جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے جس کی گرد آلودہ دیواروں میں میرا ماضی دفن ہے......!

............☆☆☆............

تھکن

اس بار جب وہ لوٹے تو دوسرے دن سویرے صرف قریب ہی کے چند ہمسائے اُن سے ملنے آئے۔ وہ اُن کی خالی خالی آنکھوں اور اُترے ہوئے چہروں کو بڑی حسرت سے تکتے رہے اور ساتھ ساتھ ان کی اندرونی کیفیت میں جیسے چند لمحے خاموشی کے ساتھ شریک رہے۔ پھر جب وہ وہاں سے کچھ کہے بغیر باہر آئے تو محمد سلطان نے بیوی فاطمہ سے قدرے احتجاجاً پوچھا ''تمہیں یاد ہے، جب ہم پہلے پہلے باہر سے لوٹتے تھے۔ دوسرے دن سویرے سے ہی کتنی بھیڑ لگتی تھی۔ بیسیوں سوال کرتے تھے......اور آج''۔

''آج وہ کیا سوال کرتے اور ہم کیا جواب دیتے''۔ کہتے ہوئے فاطمہ جیسے اندر ہی اندر سوالوں کے جواب سوچنے لگی۔ ''وہ تو ٹھیک ہے۔ پھر بھی ہماری تسلی ہی کے لئے کچھ کہتے''۔ محمد سلطان نے یہ کہہ کر جیسے خود کو تسلی دی......''اس بار مجھے پوری اُمید تھی میں نے خواب بھی دیکھا تھا''۔ فاطمہ یہ کہہ کر وہ پھر خوابوں کے تانے بانے جوڑنے لگی......

پچھلے اٹھارہ برسوں کے دوران دونوں کے چہروں پر اب جھریاں پڑ چکی تھیں اور

ان کے خواب ان جھریوں میں کہیں آنسو بن کر منجمد ہو کر رہ گئے تھے......

تقریباً ایک مہینے بعد۔ایک دن سویرے دروازے پر پھر دستک ہوئی جس کے ساتھ ہی فاطمہ کو اچانک رات کا خواب یاد آ گیا۔اس کی پتھرائی آنکھوں میں جیسے جان آ گئی۔وہ خاوند کی طرف دیکھنے لگی جو پرانی خستہ دیوار کی طرح بس گرا ہی چاہتا تھا۔بیوی کی آنکھوں میں جان دیکھ کر وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔سامنے ایک دور دراز کے پہچان والے لڑکے سلیم کو دیکھ کر تذبذب میں بیوی کی طرف دیکھنے لگا، جو آنکھیں بند کیے جیسے خواب کی تعبیر دیکھ رہی تھی۔دونوں کی حالت دیکھ کر سلیم کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہاتھ میں تھامے کاغذ کی طرف دیکھتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا......''شاید تمہیں معلوم نہیں، ہمارا ایک رشتہ دار پرسوں پانچ برس کے بعد گھر آیا ہے۔اس نے راجستھان کی ایک جیل میں تمہارے لطیف کو دیکھا ہے۔اس میں مکمل پتہ لکھا ہے۔میں نے سوچا......'' کہتے ہوئے اُس نے کاغذ محمد سلطان کے ہاتھ میں تھما دیا اور جواب سنے بغیر نکل گیا۔محمد سلطان کاغذ کو غور سے دیکھنے لگا...... فاطمہ آنکھیں کھول کر اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔پھر کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی اور دھیمی مگر پختہ آواز میں بولی......''کل رات میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا''۔محمد سلطان کو بیوی کی آواز جیسے بہت قریب سے سنائی دی۔چہرے پر عجیب طرح کا ٹھہراو سا اُبھرا۔''اس کاغذ پر بھی پتہ کچھ صاف نہیں لکھا ہے''۔کہتے ہوئے محمد سلطان نے دروازہ بند کر لیا......!!!!

............☆☆☆............

کاٹ

باولی کتیا پلّوں کے ساتھ اچانک ایک گلی سے نکل کر جونہی چوک کے بیچوں بیچ آ کر کھڑی ہوگئی، وہاں آس پاس موجود لوگ اسے دیکھ کر جیسے سکتے میں آ گئے۔ چند لمحے وہ بےبسی کے عالم میں اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر جیسے کسی مجبوری کے عالم میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف سرکنے لگے۔ بات پھیلتے پھیلتے چوک کے آس پاس گلی کوچوں اور دوسرے بازاروں تک پھیل گئی۔ اچانک وہاں ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا منہ جدھر تھا ادھر بھاگنے لگا۔ تاہم بھاگتے بھاگتے ہر ایک باولی کتیا اور اسکے پلّوں کو ایک نظر ضرور دیکھنا چاہتا تھا اور اس کیلئے ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی کے نکڑ تک جاتا۔ اگر وہاں موقعہ نہ ملتا۔ دوسری گلی میں جا گھستا۔ وہاں بھی اگر باوٗلی کیتا کو ایک نظر دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔ تو عجیب بےبسی اور بےچینی لئے کسی اور گلی کوچہ کا رخ کرتا۔ چوک کے بیچوں بیچ باوٗلی کتیا پلّوں کے ساتھ یہ منظر بڑے اطمینان کے ساتھ دیکھتی رہی۔ اب اس کے دائیں بائیں دور دور تک چوک کے سارے بازار خالی تھے۔ بازار کے بیچوں بیچ ڈھیروں چیزیں ادھر ادھر

پڑی تھیں۔ اس نے ان سب سے قدرے بے نیاز ہوکر ایک جھرجھری سی لی اور آگے کی طرف زمین سونگھتی ہوئی بڑھ گئی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ زمین سونگھتی ہوئی ایک جگہ رک گئی پھر پلٹ کر ایک نظر پلّوں کی طرف دیکھتے ہوئے دائیں طرف قصائی بازار کی طرف مڑ گئی۔ پلے جیسے اسی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ غراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ ادھر چوک سے قدرے دور گلی کوچوں اور بازاروں میں اب بھی بھگدڑ مچی تھی۔ لوگ ابھی بھی بھاگے جا رہے تھے۔ ہر ایک کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہر ایک اپنے آگے والے کو پیچھے دھکیل کر آگے کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر صرف ایک دوسرے کو یہ یقین دلانے کیلئے کہ وہ باؤلی کتیا سے خوف زدہ ہے اور اس کی کاٹ سے ڈرتا ہے۔ نہیں تو اصل میں ہر ایک دل سے چاہتا تھا کہ باولی کتیا آئے اور اسے کاٹ لے۔ پھر وہ بھی باؤلا ہوکر ایک دن اسی طرح اچانک چوک کے بیچوں بیچ آکر کھڑا ہو جائے۔ لوگ اسے اچانک سامنے پاکر جیسے سکتے میں آجائیں۔ بے بسی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے رہیں اور چوک کے اطراف میں ہر طرف بھگدڑ مچ جائے۔ ہر ایک اپنے آگے والے کو پیچھے دھکیل کر بظاہر اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے صرف اسے یہ یقین دلانے کیلئے کہ وہ بھی باولی کتیا سے خوف زدہ ہے اور اس کی کاٹ سے ڈرتا ہے۔ نہیں تو اصل میں ہر ایک دل سے چاہتا ہے کہ کاش باولی کتیا آئے اور اسے کاٹ لے۔ واہ کیا لذت ہے اس کاٹ میں۔

............☆☆☆............

سلام الدین اُداس کیوں ہے......؟

ورِیندر شرما اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ غروبِ آفتاب سے ذرا کچھ دیر پہلے جونہی بلیوواڑ پر گھاٹ نمبر 11 پر گاڑی سے اُترا تو سامنے ڈل جھیل سے آتی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جیسے اُن کی سفر کی ساری تھکن دور ہوئی۔ ورِیندر شرما کی بیوی اور بہو سُمن نے جلدی جلدی اُتر کر نیچے گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہی اپنے اپنے سینڈل اُتار دئے، پانی میں پاؤں ڈالتے ہی اُنہیں اندر ہی اندر عجیب سی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ دونوں نے مسکراتے ہوئے اُوپر گھاٹ کی جانب دیکھا جہاں ورِیندر شرما اور بیٹا کیلاش بیٹی مُنی کا ہاتھ تھامے گھاٹ سے جھیل کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ دور تک بلیوواڑ پر سیاحوں کی گہما گہمی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ البتہ مُنی کچھ کچھ اُکتائی ہوئی بے دلی سے اپنے دائیں بائیں ایسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو......اچانک گھاٹ سے ذرا دوری پر سلام الدین پر نظر پڑتے ہی کیلاش کا ہاتھ زور سے جھٹکتے ہوئے بولی......''پاپا۔ سلام الدین آ گیا'' آواز سنتے ہی دونوں نے بائیں جھیل کی طرف دیکھا۔ گھاٹ سے ذرا دوری پر سلام الدین ناؤ کھیتے ہوئے گھاٹ نمبر 11 کی طرف آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر ناؤ کے سرے پر کھڑے ہو کر چپّو کی

مدد سے ناؤ کو ہلکی ٹکر کے ساتھ سیڑھیوں کے ساتھ لگنے دیا اور اپنا ایک پاؤں سیڑھیوں پر ٹھہرا کر قریبی بیٹھی رجنی اور سُمن کی طرف دیکھا دونوں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور اپنے اپنے سینڈل ہاتھ میں اُٹھائے ناؤ کے قریب کھڑی ہو گئیں اور پہلے رجنی نے بغیر کسی خوف اور ہچکچاہٹ کے پہلے ایک پاؤں پھر دوسرا پاؤں ناؤ کے اندر فرش پر رکھ دیا۔ سمن نے بھی چاہا کہ وہ بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ساس کی طرح ہی ناؤ میں پاؤں رکھے لیکن قریب پہنچ کر ایسا نہ کر سکی اور سلام الدین کے بازو کا سہارا لے کر ناؤ میں رجنی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی... اس دوران وریندر شرما اور کیلاش مُنی کو گود میں اُٹھا کر ناؤ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ دونوں نے مسکراتے ہوئے سلام الدین کی طرف دیکھا اور وریندر شرما نے پورے اعتماد سے پہلے ایک پھر دوسرا پاؤں ناؤ میں رکھتے ہوئے رجنی کی طرح فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ رجنی نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسکے اِس عمل کو سراہا۔ چونکہ پہلے دن ناؤ میں پہلی بار اُترتے وقت جب اُس نے ابھی ایک پاؤں ناؤ کے فرش پر رکھا ہی تھا اور دوسرا پاؤں اُٹھانے والا ہی تھا کہ اُسے محسوس ہوا ناؤ اچانک گھاٹ سے دور نکل گئی ہے اور وہ بُری طرح ہڑ بڑا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا تھا کہ عین اُسی وقت سلام الدین نے آ کر اُسے پانی میں گرنے سے بچایا تھا تاہم گھاٹ پر موجود سیاحوں اور دوسرے ناؤ والوں کے سامنے تماشہ بننے سے نہ بچا تھا اور بیوی رجنی بھی اُسے دن بھر چڑاتی رہی آئیندہ اس خفت سے بچنے کے لئے اُس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس پر توجہ دی اور اب اس پر بہت حد تک قابو پا چکا تھا...... کیلاش پتا جی کی اس حرکت پر مسکرا کر رہ گیا اور مُنی کو گود میں لئے سلام الدین کے بازو کا سہارا لے کر ناؤ میں پتا جی کے ساتھ بیٹھ گیا...... سلام الدین نے چپو ناؤ میں رکھتے ہوئے ناؤ کو گھاٹ سے آگے دھکیل دیا اور جست لگا کر ناؤ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ چپو ہاتھوں میں سنبھال کر ناؤ کو

آگے کی طرف کھینے لگا......گھاٹ سے ذرا دوری پر گگری بل پارک کے جنگلے کے ساتھ ساتھ کھڑے سیاح جھیل کی سطح پر اُبھرتی ڈوبتی لہروں پر ڈوبتے سورج کی ناچتی ہوئی کرنوں سے محظوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس خوبصورت منظر کو اپنے اپنے کیمروں میں اُتار رہے تھے......وریندر شرما، رجنی، کیلاش، سُمن بھی اس خواب جیسے منظر میں کھو سے گئے۔ کیلاش اپنے کیمرے سے ڈوبتے سورج کے منظر کے ساتھ ساتھ سیاحوں کو بھی اپنے کیمرے میں اُتارنے لگا۔ تاہم اس سب سے کچھ بیزار اور بے دل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے کے دوران مُنی کی نظریں بار بار سلام الدین پر ہی جا کر ٹھہر جاتی۔ دو تین بار سلام الدین کی نظریں بھی اُس سے جا ٹکرائیں۔ لیکن وہ فوراً نظریں ہٹا کر چپّو سے ناؤ کو دوسری طرف کھینے لگتا۔ پارک سے ذرا دور نکلتے ہی جھیل کی خاموشی سے جیسے مُنی کی اُکتاہٹ بڑھ گئی۔ نظریں پھر سلام الدین کی طرف اُٹھیں، جیسے اُسکی اس اُکتاہٹ کی وجہ وہی ہو... مڑ کر کیلاش کی طرف دیکھا اور قدرے دھیمے لہجے میں بولی......"پاپا۔ سلام الدین چُپ کیوں ہے؟ ۔ وہ بات نہیں کرتا۔ صرف دیکھتا ہے......اُسکی بھی تصویر لونا؟"......مُنی کی بات سنتے ہی کیلاش نے سلام الدین کی طرف دیکھا اور کیمرہ فوکس کرتے ہوئے بولا......"کیوں نہیں......ایک نہیں، بہت تصویریں لوں گا"...... کہتے ہوئے کیلاش سلام الدین کی تصویریں اُتارنے لگا اور سلام الدین اس سے بے خبر چپّو چلاتا رہا......

بلیواڑ سے تقریباً دو ڈھائی سو فٹ کی دوری پر Paradise ہاؤس بوٹ تک پہنچتے پہنچتے اب جھیل دور دور تک پھیلی برقی روشنیوں میں نہا رہی تھی۔ قریب پہنچ کر سلام الدین نے پانی میں اُترتی ہاؤس بوٹ کی سیڑھی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر رکھا، ناؤ، جو کچھ دیر پہلے قریب سے ایک موٹر بوٹ کے تیزی سے گذرنے کی وجہ سے دائیں بائیں ڈول رہی

تھی...... ناؤ کے ساکت ہوتے ہی وہ احتیاط سے سڑھیوں پر پاؤں رکھتے ہوئے ہاؤس بوٹ کے کُھلے خوبصورت برآمدے میں آ گئے۔ وریندر شرما آخری سڑھی پر پاؤں رکھتے ہوئے سلام الدین سے مخاطب ہوا...... ''سلام الدین ہم کل جا رہے ہیں۔ ذرا خیال رکھنا۔ بارہ بجے ہماری فلائیٹ ہے اور نو بجے ائر پورٹ پہنچنا ہے......'' ''ٹھیک ہے صاحب......'' کہتے ہوئے اس نے ناؤ کو ہاؤس بوٹ کے عقب میں موڑ دیا۔ سلام الدین کی آواز سنتے ہی مُنی نیچے دیکھنے لگی۔ اُسے پانی میں چپّو چلنے کی آواز کے ساتھ ساتھ سلام الدین کی ناؤ اندھیرے میں گم ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ کچھ بے چین ہو کر کیلاش کا منہ اپنی طرف پھیر کر پوچھنے لگی...... ''پاپا...... بُولونا...... سلام الدین اُداس کیوں ہے۔'' ''اوہو...... بڑی نانی آئی ہے سلام الدین کی خیریت پوچھنے والی۔ وہ ٹھیک۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ چلو سب اندر کھانا لگ گیا ہوگا''۔ کہتے ہوئے رجنی دروازے کی طرف مڑ گئی...... مُنی کو اس سے جیسے تسلی نہ ہوئی پھر کیلاش سے پوچھنے لگی... ''بُولونا پاپا؟'' کیلاش کو فوری طور پر کچھ جواب نہ سُوجھا۔ سُمن اُسے گود میں لیتے ہوئے بُولی ...... ''نہیں بیٹا وہ اُداس نہیں ہے۔ بس وہ ایسا ہی ہے......'' کہتے ہوئے وہ اُسے گودی میں اُٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی تاہم وریندر شرما اور کیلاش وہیں اپنی اپنی جگہ کھڑے کچھ سوچتے رہے...... ڈنر کے بعد رات دیر گئے ہاؤس بوٹ کی کھلی چھت پر ٹہلتے ہوئے وریندر شرما کو اس وقت جھیل کی رنگ برنگی روشنیاں کچھ پھیکی پھیکی سی لگ رہی تھیں...... دھیان بٹانے کے لئے وادی میں گزرے واقعات یاد کرنے شروع کئے لیکن ہر بار ان میں کہیں نہ کہیں سے سلام الدین کا چہرہ بھی اُبھر آتا جس کے ساتھ ہی مُنی کی آواز......'' سلام الدین اُداس کیوں ہے؟'' کی بازگشت بھی

اُبھرآتی......'' وہ کچھ پریشان ہوکر نیچے جاتی سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے جیسے اُسکی آنکھیں خود بخود ہاؤس بوٹ کے عقب میں سلام الدین کے ڈونگے کو ڈھونڈنے لگیں......لیکن وہاں صرف اندھیرہی اندھیرا تھا...... گہرا اندھیرا...... وہ جلدی جلدی سڑھیاں اُترا گیا۔

سویرے وہ پیکنگ سے فارغ ہوکر ہاؤس بوٹ کے خوبصورت کشادہ Sitting Room میں بیٹھے ناشتہ کررہے تھے۔ سُمن نے مُنی کو قریب ہی صوفے پر لٹا دیا تھا۔ ناشتے کے دوران رجنی بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر کچھ جھنجلاتے ہوئے کیلاش سے مخاطب ہوئی......'' تمہارے پتاجی ابھی لوٹے نہیں......ناشتہ بھی نہیں کیا......شاید بھول ہی گئے کہ ہمیں نکلنا ہے، یہ سلام الدین بھی نظر نہیں آرہا ہے۔'' اس سے پہلے کہ کیلاش کچھ جواب دیتا۔ سُمن بول پڑی......'' سلام الدین آہی رہا ہوگا۔ بابوجی ناشتہ حاجی صاحب کے ساتھ ہی کرینگے کل رات ہی کہا تھا۔ ابھی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی ہے''۔ سُمن نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......'' ویسے حاجی صاحب دل چسپ آدمی۔ پتاجی کو جیسے برسوں سے جانتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی... بس آہی رہے ہونگے......'' کیلاش نے کہتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا......کیلاش کی بات سُن کر رجنی اور جھنجلا کر رہ گئی......اور'' آرہے ہونگے''......اپنے آپ سے بڑبڑاتے رہ گئی۔

اس سے پہلے کیلاش کچھ کہتا وریندر شرما ہاتھوں میں ایک چھوٹا خوبصورت پیکٹ لے کر کمرے میں داخل ہوا......شاید آپ بھول ہی گئے ہمیں نکلنا ہے......'' کہتے ہوئے رجنی نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا......'' بالکل نہیں !وہ حاجی صاحب نے ناشتے پر پوری

دعوت کا انتظام کیا تھا۔ پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا......" کہتے ہوئے اُس نے دائیں طرف کھڑکی کا پردہ ایک طرف سرکا کر دیکھا......"وہ سلام الدین بھی آ رہا ہے......" کہتے ہوئے رجنی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ پیکٹ سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا......"حاجی صاحب نے تحفہ دیا......" "کیا ہے اس میں؟......" سُمن نے پیکٹ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا......" پتہ نہیں۔ بولے گھر پہنچ کر ہی کھولنا......" وریندر نے مسکراتے ہوئے سُمن کی طرف دیکھ کر کہا......"کیا ہوسکتا ہے اس میں؟" رجنی نے کچھ تجسس بھرے لہجے میں جیسے اپنے آپ سے کہا......اس دوران سلام الدین دروازے پر نمودار ہوا......"صاحب سامان ناؤ میں رکھ دوں......" "ہاں رکھ دو......" رجنی نے جیسے اُٹھتے ہوئے کہا......"ٹھہرو...... سلام الدین ابھی اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔ بیٹھو......" کہتے ہوئے وریندر شرما نے سلام الدین کی طرف قدرے غور سے دیکھا......سلام الدین دروازے کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا......وریندر شرما نے جیب سے تہہ کیے ہوئے پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی ایک رقم نکال کر سبھوں کی طرف دیکھا پھر سلام الدین سے مخاطب ہوا......" سلام الدین میں نے حاجی صاحب سے ہاؤس بوٹ کے کرایہ کا حساب کرلیا۔ تمہارا حساب تو اُسی کے ساتھ ہے تاہم یہ چھوٹی سی رقم ہماری طرف سے رکھ لو۔ ہماری طرف سے تمہاری بخشش ہے......" رجنی نے کھلے دِل سے کہا...... سلام الدین نے دونوں کی طرف دیکھا پھر ایک نظر وریندر شرما کے ہاتھوں میں رقم کی طرف بھی دیکھا۔"جی شکریہ" کہتے ہوئے وہیں بیٹھا رہا......وریندر شرما نے روپے ٹیبل پر رکھ دیئے۔ اور پھر سلام الدین سے مخاطب ہوا......" سلام الدین تم واقعی بہت شریف ہو۔ بولتے بھی کم ہو۔ کئی بار خیال آیا تم سے بات کروں۔ لیکن تمہارے اس سورگ کے یہ خوبصورت نظارے موقعہ دیتے تب نا۔ یہ بیس دن کیسے نکل گئے پتہ ہی

نہیں چلا......سلام الدین گھر میں اور کون ہے۔ میرا مطلب ہے......''ہماری مُنّی کو تمہاری بہت فکر لگی ہوئی ہے۔ پہلے دن سے تمہارا نام ایسے زبان پر چڑھ گیا جیسے تمہیں برسوں سے جانتی ہے...... ''رجنی پتی کی بات کاٹ کر بول پڑی......''جب بھی آپکو دیکھتی ہے۔ کہتی ہے......سلام الدین اُداس کیوں ہے۔کوئی بات کیوں نہیں کرتا......؟''سُمن نے مُنّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......''بہت معصوم پیاری بچی ہے۔''سلام الدین نے منّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا......''سلام الدین سچ پوچھو ہم جہاں بھی گئے، لگتا تھا وہ آپ کو ہی ڈھونڈ رہی ہے۔ لوگوں کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر بار بار پوچھتی تھی......پاپا۔ سلام الدین اُداس کیوں رہتا ہے۔''وہ کیوں نہیں ہنستا ہے۔ وہ چُپ چُپ کیوں رہتا ہے۔''کیلاش کی بات سُن کر سلام الدین کو اپنا آپ اندر سے ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا......''سلام الدین تم اتنے گم سم اور چُپ چاپ کیوں رہتے ہو...... یہاں تمہارے اور بھی ناؤ والے ساتھی ہیں۔ وہ کتنا چہکتے ہیں۔ چیختے چلاتے، ہنستے مسکراتے اپنے حال میں مست ہیں۔لیکن تم اتنے......''۔''اُداس کیوں ہو''۔سُمن نے قدرے ہلکے سے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کر دیا۔سلام الدین اندر ہی اندر ہمت جٹا کر کچھ کہنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ورینددر شرما قدرے جذباتی ہو کر اُس سے مخاطب ہوا......''سلام الدین شاید تمہیں اندازہ نہیں تم کس سورگ میں پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں خود پر ناز ہونا چاہئے۔ ان اُونچی اُونچی برفیلی چوٹیوں سے آتی ٹھنڈی ہواؤں۔ باغوں، جھیلوں، جھرنوں، آبشاروں، سبزہ زاروں میں پیدا ہونے والا انسان کبھی اُداس رہ ہی نہیں سکتا......''ہم وہاں زندگی بھر اس سورگ میں چند دن گزارنے کی تمنا کرتے ہیں اور تم اپنی پوری زندگی اس سورگ میں گذار کر بھی اُداس ہو......''کیلاش نے پوری اپنائیت کیساتھ جیسے ورینددر شرما کے محوسات کی ترجمانی کی...... جسے سن کر ورینددر شرما کچھ اور

جذباتی انداز میں پھر سلام الدین سے مخاطب ہوا......سلام الدین اگر تمہیں روپے پیسے کی ضرورت ہے جس سے تم کوئی دوسرا کام کر سکو...... میں تمہاری مدد کرونگا......'' بھگوان کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے''......رجنی نے بھی کچھ جذباتی ہو کر ویندر شرما کی بات پوری کی......رجنی کی بات سن کر سلام الدین کے اندر برسوں سے رُکا باندھ ٹوٹنا شروع ہوا......'' سلام الدین کبھی کشمیر سے باہر بھی کہیں گئے ہو......'' سُمن کی بات سن کر باندھ میں ایک بڑا شگاف پڑ گیا...... اور......'' ہاں''...... کہتے ہوئے اُن کے چہرے تکنے لگا......'' اچھا ......کہاں کہاں گئے ہو''۔ سُمن نے پوری دلچسپی سے پوچھا......'' اُدھم پور۔ جموں، کوٹ بلوال، نگروٹہ، تہاڑ، جودھپور مدارس...... کہتے ہوئے برسوں سے بندھا باندھ ٹوٹ کر سلام الدین کی آنکھوں سے جاری ہوا...... سُمن نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر پوچھا......'' دہلی میں لال قلعہ، میٹرو، چڑیا گھر، پارلیمنٹ ہاؤس، نظام الدین، جامع مسجد نہیں دیکھے؟''......'' نہیں!'' سلام الدین نے دونوں ہاتھوں سے سیلاب کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا...... ویندر شرما، رجنی، سمن، کیلاش بت بنے تذبذب اور تجسس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے......ویندر شرما نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا......'' سلام الدین ہمارے دیش میں اور بھی بہت سی خوبصورت جگہیں دیکھنے کے لائق ہیں......سلام الدین ہمارا دیش بہت بڑا ہے۔ یہاں بیٹھ کر تم اندازہ نہیں کر سکتے تم کتنے بڑے مہان دیش کے باسی ہو...... تمہارے اس مہان دیش میں ایک سے بڑھ کر ایک مہان لوگ رہتے آئے ہیں۔ ہزاروں تیرتھ ہیں، درگا ہیں ہیں، وشال سمندر ہیں، آکاش کو چھوتی ہوئی مہان کمپنیاں ہیں، جن میں لاکھوں لوگ کام کرتے ہیں۔ سلام الدین تم اپنے آپ کو اتنا کمزور اور بے بس مت سمجھو۔ تم ایک مہان دیش کے ایک آزاد انسان ہو۔ یہ سارا مہان دیش تمہارے ساتھ ہے۔

تمہاری تکلیف سارے دیش کی تکلیف ہے......'' یہ سُنتے ہی سلام الدین کے سینے میں برسوں سے دفن خواب نے اچانک کروٹ لی......اندر ہی اندر طوفان کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور پوری شدت سے دہاڑیں مارتے ہوئے بول پڑا'' صاحب آپ مہان ہو......آپ کے یہ سب گھر والے مہان ہیں۔ یہ معصوم بچی بھی مہان ہے۔ آپکا دیش بھی مہان ہے......لیکن......'' کہتے کہتے سلام الدین کی آواز جیسے پوری طرح بیٹھ گئی......لیکن کیا؟'' کیلاش نے جیسے اپنے آپ سے ہی پوچھا۔ سلام الدین نے خود کو پھر سمیٹتے ہوئے کہا......''اٹھارہ سال پہلے یہی گرمی کے دن تھے۔ اچھا سیزن چل رہا تھا۔ حبیب اللہ کے ہاؤس بوٹ میں آپ جیسے ہی کچھ مہمان ٹھہرے ہوئے تھے......ایک دن میرا اکلوتا بیٹا رشید اُنہیں گھاٹ پر چھوڑنے گیا...... پھر واپس نہیں لوٹا......'''' واپس نہیں لوٹا!'' کیلاش کے مُنہ سے جیسے آپ ہی آپ نکل گیا......'' ہاں۔ بعد میں لوگوں نے بتایا وہاں آس پاس میں کہیں فائرنگ ہوئی تھی، جس سے گھاٹ پر افراتفری مچ گئی۔ بعد میں پولیس آ گئی اور چند اور لڑکوں کے ساتھ رشید کو بھی اپنے ساتھ لے گئی......!!!صاحب آپ کے مہان دیش میں میرا اکلوتا بیٹا رشید اٹھارہ سال سے کہیں گم ہے اُسے ڈھونڈ کے لائیے'' کہتے ہوئے سلام الدین اُن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہ اور کہنے کی اب ہمت نہیں رہی ہو ......رجنی اور سُمن جیسے ابھی بات کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھیں۔ تاہم وریندر شرما اور کیلاش کو جھیل میں پانی کی سطح تیزی سے بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وادی میں پیش آئے سارے خوبصورت واقعات ایک ایک کر کے جھیل کی گہرائیوں میں ڈوبتے محسوس ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ خود بھی ڈوب جاتے......سامنے لیٹی مُنی جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر ''ممی۔ممی۔'' کہتے ہوئے اچانک ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی......سُمن نے لپک کر اُسے گود میں

اُٹھا لیا اور سر کو سہلاتے ہوئے پیار سے پوچھا...... ''کیا بات ہے بیٹی۔ کوئی بُرا سپنا دیکھا......'' ''نہیں ممی۔'' آنکھیں میچتے ہوئے مُنی دائیں بائیں دیکھنے لگی...... نظریں سلام الدین پر جا کر رکیں، جو ہاتھوں میں بیگ وغیرہ اُٹھائے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ منی اُسے غور سے دیکھتی رہی، جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو...... وریندر شرما، رجنی، کیلاش اور سُمن سانس روکے اُس کی طرف دیکھتے رہے۔ اُنہیں سٹنگ روم میں آویزاں ایک پینٹنگ کی طرح اپنا وجود پینٹنگ کے خوبصورت فریم میں بے جان سا محسوس ہونے لگا...... ''ممی بولو نا سلام الدین اُداس کیوں ہے؟......'' منی کی آواز سُنتے ہی وہ سب فریم سے باہر آئے۔ سامنے سلام الدین کھڑا مُنی کی طرف دیکھا رہا تھا...... ''صاحب سامان رکھ دیا ہے۔'' کہتے ہوئے سلام الدین واپس دروازے کی طرف مڑ گیا۔ رجنی، سُمن، کیلاش سر جھکائے سلام الدین کے پیچھے پیچھے دروازے کی طرف بڑھے۔ البتہ وریندر شرما وہیں کھڑا رہا۔ سامنے ٹیبل پر پڑی بخشش کی رقم کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب کے تحفہ کو دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر پہلے تحفہ ہاتھ میں اُٹھایا اور پھر پانچ پانچ سو کے نوٹوں کی رقم بھی اُٹھا کر واپس جیب میں رکھ دی۔ اور جلدی جلدی کمرے سے باہر نکل گیا......!!!

............☆☆☆............

تبصرے

''اعلان جاری ہے''
کشمیر کے مقاومتی ادب میں قابل قدر اضافہ

مبصر: ڈاکٹر جاوید اقبال

'اعلان جاری ہے' کسی افسانوی مجموعہ کے عنوان کے بجائے سیاسی نعرے کی گونج لگتی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ افسانوی مجموعہ کا عنواں ہوتے ہوئے بھی یہ دراصل اپنے اسلوب میں یا ایسا کہیں اپنے بطن میں ایک للکار لئے ہوئے ہے جو گذشتہ سے پیوست ہونے کے بجائے حال سے جڑی ہوئی کسی ایک فرد کی نہیں کسی خاص گروہ کی نہیں بلکہ ایک ایسی قوم کی داستاں ہے، جس نے بیشمار ستم سہے بیشمار قربانیاں دیں، جس نے بہتی رگوں کے خون کے دریائے بہائے لیکن آگ اور خون کے اس سیلاب سے گذرتے ہوئے بھی کبھی نہ جھکنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'اعلان جاری ہے' کو اُن حالات و واقعات کے آئینے میں، جو کہ پچھلی ایک چوتھائی صدی سے کشمیر میں رواں دواں ہے، پرکھا جائے تو افسانہ نگار غلام

نبی شاہد کی تاریخی جانچ کو داد تحسین دیئے بغیر نہیں رہا نہیں جا سکتا۔اُن کے افسانوی مجموعہ میں ہر وہ افتاد چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے جس کا سامنا عام و خاص کو کرنا پڑا۔کہا جا سکتا ہے کہ 'اعلان جاری ہے' کی للکار کشمیر کے مقاومتی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور غلام نبی شاہد ادب کے اِس میدان میں اُن نامور ادیبوں سے کہیں زیادہ قد آور نظر آتے ہیں جن سے مقاومتی ادب کی آبیاری کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن شاید باد مخالف کی تند و تیز ہواؤں سے بچنے کیلئے میدان کارزار میں ہماری ادبی دنیا کے سورما اپنا رول ادا کرنے سے معذور رہے اور قرعہ فال غلام نبی شاہد جیسے ذی حس و باشعور افراد کے نام نکل آیا جنہوں نے اپنی ادبی کاوشوں کو اُس رُجحان کے نام کر دیا۔

مقاومتی ادب یا لٹریچر کی اپنی ایک تاریخ ہے اور ہر زماں و مکاں میں شاعروں، ادیبوں اور قلمکاروں نے بلکہ فنون لطیفہ سے وابستہ ہر شعبے نے، چاہے وہ کسی مصور کی تصویر کشی ہی کیوں نہ رہی ہو، سیاسی تحریکوں کی آبیاری میں، جن کا تعلق اکثر و بیشتر حصول حقوق بشر رہا ہے، قابل قدر رول ادا کیا ہے۔قدیم یونان میں سقراط نے سماج کے پسماندہ طبقوں و نو جوانوں کے ساتھ حُکام کی زیادتیوں کے خلاف جو کچھ تحریر و تقریر میں بیاں کیا اُس سے، کہا جا سکتا ہے، مقاومتی ادب کی بنیاد فراہم ہوئی۔البتہ اِس کیلئے سقراط کو بھاری قیمت چکانا پڑی۔وہ قید کر لئے گئے اور اُن کی سزا کی یہی انتہا نہیں رہی بلکہ زمانے کی تعزیرات کے مطابق اُنہیں زہر پینا پڑا اور یہ زہر تاریخ میں ہملاک کے نام سے ثبت ہوا ہے۔سقراط کے جیلر نے اُنہیں راہ فرار اختیار کرنے کی، یہ کہہ کے، ترغیب دی کہ وہ جیل کا دروازہ کھلا چھوڑیں گے لیکن سقراط نے قرار کو فرار پہ ترجیح دے کے مقاومتی ادب کو جلا بخشی۔ماضی کی

تاریخ میں جب انقلاب فرانس کی ورق گردانی ہوتی ہے تو روسواور والٹیر دو ایسے نام سامنے آتے ہیں جو انقلاب کے ہراول دستے کے سرخیل تھے اور اُنہوں نے انقلاب کی ادبی زمین کی بھی آبیاری کی اور دو صدیوں سے بیشتر زمانے کی گذشت کے باوجود آج بھی انقلاب فرانس کو اُنہی کی نگارش میں پرکھا جاتا ہے۔

تاریخ میں اور بھی کئی دور ہیں، زمانہ گذشتہ کی کئی کروٹیں ہیں، جنہیں ادیبوں کی تحریروں میں پڑھا جا سکتا ہے حالانکہ ہر دور کی تاریخ کی کتابوں میں بھی منعکس ہوا ہے لیکن مورخین کی مرتب کردہ تواریخ کی خشکی میں وہ تروتازگی کہاں جو حساس ادیبوں کی رنگین بیانی میں ہے۔ تاریخ اسلام کو ہی پرکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ جو نسل آج ایام پیری سے گذر رہی ہے اُن میں سے اکثر و بیشتر نے تاریخ اسلام کو تاریخ کی کتابوں میں جانچنے کے بجائے اُسے نسیم حجازی کے ناولوں میں تلاش کیا، جن کے کرداروں کو حجازی نے ایسے رنگ بخشے کہ زمانہ گذرنے کے باوجود اُن کی مہک بیشمار وجودوں میں رچی بسی ہے۔ نسیم حجازی نے عروج مسلمین سے زیادہ دور انحطاط یعنی مسلمانوں کے زوال میں اپنے کرداروں کو تلاش کیا ہے تاکہ وہ آنے والی نسلوں کو یہ سمجھا سکیں کی انحطاط کے اسباب کیا تھے اور یقیناً اُن کی تلاش یہی رہی کہ انحطاط کے سدباب کی راہوں کو تلاش کرنے کی تحریک شروع ہو سکے۔ علامہ اقبال کی شاعرانہ کاوشوں کو بھی اِسی پیرائے میں پرکھنے کی ضرورت ہے جسے ادب برائے انسان سازی و ارتقائی قوت و مقاومت کہا جا سکتا ہے اِسی لئے اُنہوں نے اپنے کلام کو ماورائے شاعری قرار دیا یعنی ایک ایسی تخلیق جو شعر کی زباں میں ہوتے ہوئے بھی شاعری نہیں ہے۔

مقاومتی ادب میں اگر چہ شاعری اور نثر میں ناول نگاری کی اضاف جانی پہچانی ہیں البتہ افسانوی ادب میں مقاومتی رنگ کم ہی جھلکتا ہے یہی وجہ رہی کہ جب میرے عزیز دوست وہم قلم وکلام زیڈ جی ایم (ZGM) نے مجھ سے کہا اِس میں مقاومتی ادب کی مہک ہے تو میری حیرانگی کی حد نہیں رہی کیونکہ ہمہ گیر مقاومت کو افسانے میں سمونے کی کوشش ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے البتہ جونہی اُسے ہاتھ میں لیا تو مجھے اپنے رفیق کی کہی ہوئی بات کی صداقت کا اعتبار ہونے لگا۔ مملکتی تضاد کی مہربانیوں کے نتیجہ میں کشمیر اور کشمیریوں کو جو سختیاں جھیلنی پڑی ہیں اور جو آج تک ایک نہ ٹوٹنے والا تسلسل لئے ہوئے ہے اُس کا ہر رنگ و ہر روپ اِس قدر عیاں، بیاں ہوا ہے کہ افسانہ نگار کی باریک بینی اور فن نگارش کا معتقد ہونا ہی پڑتا ہے اور اِس کا احساس بھی ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے زمانے کی دُکھتی رگ کو جانچتے ہوئے اُسے الفاظ میں تراشا ہے۔ جانچ وتراش کی اِس کاوش میں جو کردار اُبھر آئے ہیں اُنہیں یہاں کا ہر بسکین بخوبی پہچانتا ہے البتہ گویائی کا فن ایک فنکار کا ہی خاصہ ہوسکتا ہے اور ماننا پڑے گا کہ اِس فن میں مصنف غلام نبی شاہد ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

افسانوں کے اِس سلسلے میں کہیں تلاشیوں کی روداد ہے، کہیں بموں کے پھٹنے کی گونج اور کہیں گولیوں کی گھن وگرج ہے، کہیں کھوئے ہوئے جگر گوشوں کی تلاش میں غم و اندوہ سے نڈھال والدین ہیں، جن کے غم کا مداوا دور دور تک نظر نہیں آتا تو کہیں نیم بیوائیں ہیں جن میں نہ زندگی کی حرارت ہے نہ موت کی ٹھنڈک، جن کیلئے زندگی بے معنی ہوتے ہوئے بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی اور کہیں بے نام قبریں ہیں جن کے مکینوں کی کوئی پہچان نہیں۔ جہاں ستم سہنے والے وجود ہیں وہی ستم ڈھانے والوں کی انسانیت بھی کبھی کبھی ایسے

رنگ دکھاتی ہے کہ یہ اعتقاد ہونے لگتا ہے کہ ستم کو ستمگار کے وجود میں ٹٹولنے کی سعی صحیح نہیں کہلائی جا سکتی۔ستم کو ڈھانے کے پس پردہ ایک ایسی تحریک ہوتی ہے جو جائز نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا وجود ستم سے منوانے کی کوشش کرتی ہے اور ظاہر ہے یہ منوانے کے لئے انسانوں کو وسیلہ بنایا جاتا ہے البتہ کبھی نہ کبھی انسانیت اُبھر آتے ہی ایسے جلوے دکھاتی ہے جہاں انسانی نکھار کا رنگ نظر آتا ہے۔

غلام نبی شاہد کو مقاومتی افسانہ نویسی کی شہ اتفاقاً اپنے لڑکپن کے دوست دلیپ کمار نہرو سے ملتی ہے جو 1960ء کے دہے میں اُنہیں لال چوک میں فلم دیکھنے کیلئے لے جانے پہ بضد ہیں لیکن مصنف کا دل نہیں مانتا اور وہ انکار پہ مُصر ہیں۔دلیپ اکیلے ہی روانہ ہوتا ہے البتہ واپسی اُس کے زندہ وجود کی نہیں بلکہ جسد کی ہوتی ہے۔دلیپ ایک احتجاج کے نتیجے میں ہوئے تشدد کا شکار ہوتا ہے۔لڑکپن کے دوست کی بے ہنگم موت مصنف کے حساس وجود پہ ایک دائمی اثر ڈالتی ہے اور نفسیاتی اُلجھن میں وہ دلیپ کو کئی بار خواب میں دیکھتا ہے یہ سوال کرتے ہوئے کہ ''میں قتل کیوں ہوا''؟ اس سوال نے مصنف کی تحریر میں جان ڈالی ہے کیونکہ کشمیر کی تحریک کا بنیادی سوال یہی ہے ''میں قتل کیوں ہوا''؟ میں نے کس جرم کی سزا پائی؟ اور یہ بھی کہ کیا آزادی کی تلاش و حقوق بشر کی بازیابی کی سعی کو کسی بھی صورت سے کسی بھی عنوان سے علٰحیدگی پسندی یا تخریب کاری کا نام دیا جا سکتا ہے وہ بھی اُس صورت میں بھی جہاں یہ تلاش یہ سعی ماورائے تشدد خالص و خالص امنیتی راہوں پہ راہ پیما ہو؟

راقم الحروف یقیناً غلام نبی شاہد کی ادبی کاوش اور ان کے افسانوی مجموعہ کے قارئین کے بیچ میں نہیں آنا چاہتا۔ویسے بھی اِن کے افسانوں کے بیاں کامل کیلئے ایک کالم

کافی نہیں ہوسکتا البتہ اشارروں و کنایوں میں افسانوں کو پرونے کی کوشش کی جاسکتی ہے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ ہوسکے کہ الفاظ میں ستمگار کے ستم کو کیسے پرویا گیا ہے۔ افسانوں کا یہ سلسلہ جمیلہ کی چیخ سے شروع ہوتا ہے جس کا بیٹا پانچ دن پہلے کمپیوٹر سنٹر پہ گیا تو ضرور تھا لیکن واپسی اُس کے جسد کی ہوئی کیونکہ وہ ایک بم دھماکے میں جانِ عزیز گنوا بیٹھا تھا لیکن جسد کے ساتھ اسکا کٹا ہوا ہاتھ نہیں تھا، جو تلاش کے باوجود اُس کے شوہر افضل کو مل نہیں پایا، آخرت کے سفر کا راہ پیا، جمیلہ کا لختِ جگر، خواب میں کٹے ہوئے ہاتھ کا پتہ بتاتا ہے اور اُسے ایک پیڑ کی شاخ پر پانے کے بعد ماں ایک سفید تھیلے میں رکھتی ہے تب تک افضل لوٹ آتا ہے اور جمیلہ تھیلے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تھیلے میں کٹے ہوئے ہاتھ کو جب افضل دفن کرنے کیلئے لے جاتا ہے تو اُسے وہ کافی بھاری لگتا ہے۔ جواں بیٹے کے جسم کا ایک انگ اور باپ کا کندھا ہلکا ہو ہی کہاں سکتا ہے؟

مزار شہدا کے عقب میں گنجان محلے کی بسکین حلیمہ جوانی میں بیوگی کا بوجھ لئے یکسوئی سے اپنے دونونہالوں آصف و زینب کو سنبھالے اپنے سے جدا ہوئے شوہر مشتاق کے مزار کو، جب جب بھی وہ گلی کے نکڑ پہ واقع مدرسے میں اپنے بچوں کو پڑھائی کیلئے لے جاتی ہے، ٹکٹکی باندھے دیکھنے سے باز نہیں رہ پاتی۔ مشتاق ایک محاصرے کے دوراں گولیوں کی گھن گرج میں ایک زوردار دھماکے کی آواز سنتا ہے۔ تھوڑی دیر میں جب کچھ دیر کیلئے خاموشی چھا جاتی ہے تو اُسے ہمسایوں کی فکر ہونے لگتی خاص کر عشہ دید کی کیونکہ ایسا لگتا ہے کہ دھماکہ اُنہی کے مکان میں ہوا۔ حلیمہ کے روکنے کے باوجود مشتاق باہر نکلتا ہے اور دوسرے دن محلے کی پانچ لاشوں میں اُس کی بھی لاش ہوتی ہے۔ اُس دلدوز واقعے کے بعد

پھر ایک دن کرفیو دھماکوں کے دوران حلیمہ اپنے بچوں کو سکول میں نہ پاتے ہوئے اُن کی تلاش میں دربدر پھرتی ہوئی مزار پہ پہنچ جاتی ہے اُسے احساس ہوتا ہے کہ مزار کے در پہ اُس کا کھویا ہوا شوہر بچوں سمیت اُسے بلا رہا ہے۔ اندر جا کے اُسے دونوں بچے باپ کے مقبرے پہ اُس کے سینے پہ سر رکھے ہوئے گہری نیند میں سوئے ہوئے ملتے ہیں۔ جہاں حلیمہ بچوں کے لئے سرگرداں ہے وہی آخرت کی نیند میں سویا ہوا باپ بھی بچوں کی فکر سے غافل نہیں!

سریندر سیکورٹی فورس میں پچھلے ڈیڑھ سال سے اپنی ڈیوٹی کو نبھاتے ہوئے اپنی چار سال کی بچی کنول کو بھول نہیں پاتا معصوم کی کلکاریاں اُس کے وجود پہ چھائی رہتی ہیں۔ ایک دن صبح سویرے وہ حسب معمول کرفیو نافذ کرنے والے دستے کے ساتھ ایک پل پہ تعیناتی کے دوران چھٹی کی آس لگائے بیٹھا ہے جس کی درخواست اُس نے مہینہ بھی پہلے دے رکھی تھی، کہ اچانک اُسے کسی بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پہلے تو وہ سُنی اَن سُنی کرتا ہے لیکن بچے کی بلک بلک رونے کی آواز کے ساتھ ہی اُسے اپنی بچی کنول کی یاد آتی ہے اور اُس کے اندر وہ انسانیت بیدار ہو جاتی ہے جو ہر انسان میں ہوتی ہے، بھلے ہی وہ شعور کے کسی تہہ خانے میں چھپی ہوئی ہو۔ رونے کی آواز ایک ایسے بچے کی ہے جو بھوکا ہے اور جسے اُس کا باپ قادر چُپ کرائے چُپ نہیں کر پاتا۔ تلاش کے بعد سریندر کو آواز کا سراغ پل کے نیچے دریا کی سطح پر ایک ڈونگے میں ملتا ہے۔ کرفیو نافذ کرنے والے سپاہی کو سامنے پا کر ڈونگے والا قادر خوفزدہ ہو جاتا ہے لیکن سریندر کی جاگی ہوئی انسانیت اُسے نرمی سے بچے کے رونے کی وجہ پوچھتی ہے۔ شہر میں کرفیو ہے، قادر کے

ہاں نہ چاول ہیں نہ خریدنے کیلئے پیسہ۔ یہ جان کے سریندر اُسے پوچھتا ہے کہ چاول کہاں ملینگے۔ قادر اُس کے ساتھ محی الدین کی دُکان پہ آتا ہے جو سپاہی کے حکم پہ اپنی بند دُکان کھولتا ہے سریندر بچّے کی طرف دیکھتا ہے جو چپس کے پیکٹ کو دیکھ کے بلکنے لگتا ہے۔ سریندر اُس کیلئے ایک چپس پیکٹ بھی خریدتا ہے اور بچہ ہاتھ میں پیکٹ لیتے ہی چُپ ہو جاتا ہے۔ سریندر قدرے اِطمینان سے اُسے پوچھتا ہے ''شاباش۔۔۔اب بولو اور کیا چاہیے'' بچّہ ہاتھ میں چپس کا پیکٹ لئے بڑے اِطمینان سے جواب دیتا ہے '' آجادی''!

افسانہ تو افسانہ حقیقت میں بھی سریندر جیسے سپاہیوں کی جاگی ہوئی انسانیت کی سائنسی جانچ ہوئی ہے اور یہ پایا گیا کہ سپاہی کسی بھی قوم کا ہو، طویل مدت تک ستم کا حصہ بننے سے اُسے ستمگار سے ہمدردی ہونے لگتی ہے اور نفسیاتی کتابوں میں اُسے سٹاک ہوم سنڈروم Stockholm Syndrome کا نام دیا گیا ہے۔ سٹاک ہوم یورپی ملک سویڈن کی راجدھانی ہے، جہاں یہ سائنسی تجزیہ ہوا۔ اس تجزیہ کی اشاعت کے بعد اسرائیل نے فلسطین میں اپنے فوجیوں کی لمبی تعیناتی بند کردی۔ افسانے کو حقیقت کا روپ دینے کے بعد میں مصنف و قارئین کے بیچ حائل نہیں ہونا چاہتا۔ معمولی قیمت پہ دستیاب المختار پبلی کیشنز انت ناگ (اسلام آباد) کی یہ اشاعت سکندر نیوز ایجنسی لالچوک ،تھری ڈی ڈزائننگ آبی گذر پہ مل سکتی ہے اور اسے پڑھنے کیلئے میرا اصرار کتابی جائزے کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ اللہ نگہباں۔ یار زندہ صحبت باقی!

کشمیر اعظمی ۵ جنوری ۲۰۱۴ء

ایک تاثر

مبصر: پروفیسر قدوس جاوید

اسے قسمت کی ستم ظریفی کہئے یا سیاست کی بازی گری کہ علم و آگہی اور امن و آشتی کے قدیم ترین گہوارے کشمیر کو آج بہ انداز دگر دیکھنے کی روش عام ہو چلی ہے۔ کشمیر اور کشمیری جیسے الفاظ سامنے آتے ہی تنگ نظروں کے ذہنوں میں دہشت گردی، علیحدگی پسندی اور فرقہ پرستی جیسے الفاظ متحرک ہو جاتے ہیں جبکہ سچ یہ ہے کہ آگ اور خون سے لبریز کئی دہائیوں کے پل صراط سے گزر آنے کے بعد بھی کشمیر فرقہ وارانہ اتحاد کا سب سے روشن استعارہ ہے اور کشمیری قوم آج بھی ہندو مسلم اتحاد کے امین ہیں۔ اس بات کا اندازہ غلام نبی شاہد کے افسانوی مجموعہ ''اعلان جاری ہے'' سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اور ایک غلام نبی شاہد ہی کیوں۔ وادی کے بزرگ ترین افسانہ نگار نور شاہ کے افسانوی مجموعہ ''آسمان پھول اور لہو'' مشتاق مہدی کے ''آنگن میں وہ'' اور دیگر متعدد افسانہ نگاروں کے یہاں افسانوں کے مرکز میں سب سے متحرک ''سچ'' امن و آشتی انسان دوستی اور اتحاد ہی ہے۔

غلام نبی شاہد کا مجموعہ ''اعلان جاری ہے'' میں شامل ۲۲ افسانے واقعتاً گزشتہ ۲۲ برسوں میں کشمیریوں پر جو کچھ گزرا ان کی حکایات خونچکاں ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غلام نبی شاہد نے اپنے افسانوں میں سطحی جذباتیت یا سیاست کے زائیدہ مفروضات کو سامنے رکھ کر کردار اور واقعات گھڑے ہیں۔ بلکہ بڑی فنکارانہ سادہ لوحی اور ایماندارانہ انداز میں سچ کے مختلف رنگوں کو پیش کیا ہے۔ نور شاہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:۔

''ان کے افسانوں میں سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں''

دراصل غلام نبی شاہد نے اپنے افسانوں کی ''بنت'' میں نہ تو سنی سنائی باتوں کو جگہ دی ہے نہ افواہوں اور گھڑے ہوئے واقعات کو بلکہ انہوں نے اپنے افسانوں میں وہی واقعات، کردار اور تاثرات پیش کئے ہیں، جن کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا ہے یا جو ان کے سامنے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی جنہیں دیکھ کر جھیل کر ان کے تخلیقی وجود میں جو تاثرات و کیفیات پیدا ہوئے ہیں انہیں بڑی حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ افسانوں کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔

گولی، بندوق، گرینیڈ، کرفیو، تلاشی آگ اور خون اور کریک ڈاؤن وغیرہ کشمیر کے حوالے سے محض استعارے نہیں ایسی تلخ سچائیاں ہیں جو صرف اہلِ کشمیر کے جسم و جاں کو ہی نہیں ذہن اور ضمیر کو بھی مجروح کرتی رہی ہیں۔ اس صورتِ حال کے پس پشت کون سے نظریات اور کیسے کیسے محرکات کارفرما ہیں۔ ناگفتنی ہیں، لیکن اس کے باوجود کشمیر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا چراغ روشن ہے اس کی زندہ مثال، غلام نبی شاہد کے افسانوی مجموعہ ''اعلان جاری ہے'' کا یہ انتساب ہے۔

''دلیپ کمار نہرو کے نام...... جس نے خواب میں مجھ سے پوچھا۔ میں قتل

کیوں ہوا؟''

دراصل غلام نبی شاہد انسانیت کا پرستار ہے۔ شاہد کی مذہبیت سے انکار نہیں لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے شاہد کے افسانوں کا بنیادی وظیفہ ''انسان'' ہی ہے۔ انہوں نے عرضِ حال کے تحت خود لکھا ہے:۔

> ''دنیا میں تخلیق کار کے لئے شروع سے صرف ایک ہی موضوع رہا ہے اور وہ ہے اللہ کی یہ کائنات آدم اور آدم سے منسلک مسائل...... اللہ کی یہ تخلیق ''آدم''، دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو......کوئی بھی زبان بولتا ہو...... اُس کا رنگ کیسا بھی ہو......کوئی بھی زبان بولتا ہو...... اُس کا رنگ کیسا بھی ہو......کوئی بھی نظریہ رکھتا ہو......مگر بھوک ایک جیسی ہی لگتی ہے۔ زخم لگتا ہے تو خون بھی ایک جیسا ہی بہتا ہے...... کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو آنسوؤں بھی ایک جیسے ہی نکلتے ہیں......اور سچا تخلیق کار آدم کے انہی زخموں سے بہتے خون اور آنکھوں سے جاری آنسو میں اپنا قلم ڈبو کر اپنی تخلیق، تخلیق کر کرتا ہے۔''

دراصل سوچ کے اسی زاویے نے غلام نبی شاہد کو دلیپ کمار نہرو، علی محمد اور مشتاق جیسے معصوموں کے قتل کو انسانیت کے قتل کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ امتیاز غلام نبی شاہد کے فن کو ''کشمیر مرکز'' ہونے کے باوجود آفاقیت بھی بخشتا ہے۔ اسی لئے گلوبلائزیشن کے اس عہد میں غلام نبی شاہد کے افسانے یہ ثابت کرتے ہیں کہ افسانہ ہماری اجتماعی بصیرت، قومی تشخص کے شعور اور سانجھے دُکھ درد کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ نور شاہ سے لے کر شبنم قیوم، مشتاق مہدی،

عبدالغنی شیخ اور غلام نبی شاہد کے ایسے تمام افسانے جن میں مخصوص آئینی حیثیت کے حامل کشمیر کے روزمرہ کی خوں آشام سچائیوں کو افسانی کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہے۔ صحیح معنوں میں کشمیر اور اہلِ کشمیر کی زندہ اور متحرک۔ سچائیوں تو ہیں لیکن ان سچائیوں کا سلسلہ عالمِ انسانیت کی ان قوموں کی ناگفتہ بہہ سچائیوں سے بھی جڑ جاتا ہے جو چند بڑی اور مصلحت پسند ملکوں اور قوموں کی سازشوں کے سبب ترقی کی رفتار میں نہ صرف پیچھے چھوٹ رہی ہیں بلکہ جن کا حال (Present) جہنم زار بن رہا ہے اور مستقبل ایک دھند میں ہے۔ چنانچہ کشمیر کے کئی پرانے اور نئے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں کشمیر کے حالات کے تناظر میں Domestification کا غلبہ ضرور ہے، واقعات، کردار، ماحول مقامات اور اسما مقامی تو ہیں لیکن ان کی فنی و جمالیاتی پیش کش اس انداز میں ہوئی ہے کہ کشمیر کے درد و غم کی خاموش آوازیں لفظ لفظ جغرافیائی حدوں کو توڑ کر دنیا کی ان تمام قوموں اور افراد تک پہنچ رہی ہیں جو امن پسندی اور انسان دوستی کو عزیز رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے نور شاد اور غلام نبی شاہد کے حالیہ افسانے کشمیر اور کشمیری قوم کے کرب کو عالم انسانیت کا کرب بنانے میں ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

غلام نبی شاہد کے افسانوی مجموعہ ''اعلان جاری ہے'' میں محمد یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال اور رفیق راز نے کشمیر کے عصری خارجی حالات کے تناظر میں بجا طور پر غلام نبی شاہد کے افسانوں پر مخلصانہ رائے زنی کی ہے۔

لیکن گذشتہ دو ڈھائی دہائیوں میں کشمیری قوم پر محیر العقول انداز میں، جو کچھ گزری ہے اس کے نتیجے میں کشمیر کی ایک بڑی آبادی کی نفسیات اور روح تک لہولہان ہو چکی ہے۔ غلام نبی شاہد نے اس زاوئے سے جو افسانے لکھے ہیں وہ افسانے سے زیادہ

مرگ انبوہ، شکست ذات اور ذہنی ہیجان کے صداقت نامے ہیں۔ چند افسانوں کے متون سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

افسانہ ''مداوا'' دھماکے میں اکلوتے نوجوان بیٹے جاوید کی موت کے بعد ''ماں'' پر وقتی طور پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے جیسے اس کا پورا وجود کہیں کسی بے حس و حرکت آبادی میں گم ہو گیا ہو۔ لیکن جب جوان بیٹے کو کھو دینے کا احساس ایک دلدوز چیخ بن کر ماں کے کھوکھلے وجود سے باہر آتا ہے تو قاری کو ایسا لگتا جیسے یہ صرف جاوید کی ماں کی نہیں کشمیر کی ان ہزاروں ماوؤں کی چیخیں ہیں جن کے جوان بیٹے نہ جانے کہاں کہاں کھوئے گئے:۔

''میں نے ابھی جاوید کو خواب میں دیکھا اس کے ساتھ اس کے اور بھی دوست تھے۔ ان کے جسموں سے خوشبو آ رہی تھی یہ کہتے ہوئے جمیلہ پر غشی طاری ہوئی اور محمد افضل کی جیسے روح ہی نکل گئی۔ ٹانگیں تھرتھرانے لگیں، اپنا آپ زمین کے اندر دھنستا ہوا محسوس ہوا۔ نظر میں سامنے سرہانے رکھے قرآن شریف پر پڑتے ہی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک نہ تھمنے والی دھار نکل کر اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ جمیلہ کے رُخساروں کو بھی تر کر گئی۔''

(افسانہ۔ مداوا اعلان جاری ہے)

سرینگر کے لال چوک میں اکثر ایسی مائیں جمع ہوتی دکھائی دیتی ہیں جن کے ہونٹوں پر اُداسی کی پیڑیاں جمی ہوتی ہیں اور آنکھوں سے کبھی نہ تھمنے والے آنسوؤں کے دھارے ہوتے ہیں لیکن ہاتھوں میں کسی اپنے کی تلاش کے لہورنگ الفاظ میں لکھا پلے بورڈ ہوتا ہے:۔

''خدیجہ نے لوگوں کی طرف دیکھا......وہ آہستہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اورلرزتے ہاتھوں سے اپنا ''پلے کارڈ'' پوری قوت سے آسمان کی طرف بلند کیا...... سڑک پر جمی بھاری بھیڑ نے دیکھا۔ ایستادہ ہورڈنگ پر پیش منظر میں بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا''۔

اگر فردوس برروئے زمیں است

ہمیں است ہمیں است ہمیں است

اس شعر کے ٹھیک نیچے خدیجہ کے پلے کارڈ پر لکھا تھا:

میرا فردوس کہاں ہے؟۔

(افسانہ......جواب دو)

کشمیر میں اب حالات قدرے بدل رہے ہیں۔لیکن کیا کبھی مستقل پُرامن بدلاؤ آئے گا؟اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں۔گرچہ ہر شخص کی خواہش یہی ہے کہ کشمیر میں ایک بار پھر سے امن وآشتی کا موسم لوٹ آئے۔لیکن حالات معمول پر آ بھی جائیں تو ان والدین کے خزاں رسیدہ دلوں میں کیا کبھی موسمِ بہار کے شگوفے پھوٹیں گے جن والدین کے بچے ہنستے کھیلتے نا تمام حسرتوں کے ساتھ حالات کی بھینٹ چڑھ گئے۔اس کا جواب افسانہ ''درد کا دریا'' کے کردار علی محمد کے دلی سے آئے ہوئے دوست راجیش کی سمجھ میں نہیں آسکا۔راجیش نے اپنے دوست علی محمد کے بچوں،منی،صیف اور جاوید کو اپنی گود میں کھلایا تھا اور کاندھے پر بٹھا کر گھمایا تھا۔لیکن علی محمد نے راجیش کو بتایا:

''منی آٹھویں جماعت میں تھی۔ایک دن صبح اسکول کے لئے نکلی پھر

واپس نہیں آئی......اس روز جب تین بجے چھٹی ہوئی اور وہ بچوں کے ساتھ باہر آئی، اسی وقت اسی جگہ پر ایک زوردار دھماکہ ہوا......وہ مرگئی اور بھی بچے مرگئے۔

۲۔"......یہ دکان دیکھتے ہو۔ دو سال ہوئے، ایک دن صیف یہاں کراس فائرنگ میں مارا گیا۔ اس کی لاش دو دن اس دُکان میں پڑی رہی"۔

۳۔"جاوید کو بزنس کا بڑا شوق تھا۔ اس نے تعلیم پوری کی...... اچانک ایک دن۔ شام کو گھر آتے ہوئے "کراس فائرنگ" کے دوران اس عمارت میں جان بچانے کی غرض سے چھپ گیا دوسرے دن ملبے سے اور لاشوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ادھ جلی لاش ملی۔"

(افسانہ۔ درد کا دریا)

یہ سچ صرف علی محمد کا نہیں۔ سینکڑوں ہزاروں منی، صیف اور جاوید اسی طرح جان بحق ہوئے اور دلی سے آنے والے راجیش یا کسی اور کے لئے یہ سمجھنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے کہ کشمیر کے لوگوں کے ذہنی بحران اور خلفشار سے لے کر قلب وضمیر، صبر وسکون تک رواں دواں "درد کا دریا" تو کیسے عبور کیا جائے۔

فنی اور جمالیاتی اعتبار سے عمدہ افسانوں کا واقعہ یہ ہے کہ غلام نبی شاہد افسانوی مجموعہ "اعلان جاری ہے" مجموعہ تو ہے ہی لیکن اپنے متون کی سچائیوں اور تاثرات کی طرفوں کے حوالے سے۔ یہ مجموعہ کشمیر اور کشمیریوں کے درد کا اعلان بھی ہے اور یہ اعلان جاری ہے۔

............☆☆☆............

ایک جائزہ

مبصر: دیپک بدکی

حال ہی میں غلام نبی شاہد کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'اعلان جاری ہے' کشمیر کی وادی کا کرب اپنے اندر سمیٹے ہوئے منصۂ شہود پر رونما ہو چکا ہے۔ غلام نبی شاہد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ 'کتنے جھنڈے' سے کیا تھا جو روزنامہ آفتاب میں ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں کئی نئے افسانہ نگار روزنامہ 'آفتاب' اور دیگر اخباروں میں چھپ رہے تھے جن میں راقم التحریر بھی شامل تھا۔ ان میں سے چند ایک ریڈیو اور دوردرشن میں ملازم ہو گئے، چند ایک سرکاری دفتروں میں جذب ہو گئے اور کچھ صحافت کے ساتھ جڑ گئے۔ تب سے غلام نبی شاہد اپنا یہ تخلیقی سفر کبھی سست رفتاری سے اور کبھی تیز گامی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ 'اعلان جاری ہے' اسی سفر لا انتہا کی دستاویز ہے۔

اس سے پہلے کہ شاہد کے افسانوں کا تجزیہ کیا جائے، میرا فرض بنتا ہے کہ اس تناظر کو پیش کروں جس میں یہ کہانیاں رچی گئی ہیں ۹۰-۱۹۸۹ء میں کشمیر میں حالات نے ایسی کروٹ لی کہ ہر کوئی آنکھیں ملتا رہ گیا۔ برٹش انڈیا کی تقسیم کا ناسور، جو تب سے رستا رہا ہے، پھر سے بہنے لگا۔ ۱۹۹۰ء میں جموں و کشمیر ایک ایسے دور میں داخل ہوا جس کے بارے میں فریقین الگ الگ دعوے پیش کرنے لگے۔ کشمیر کی سچائی ہندوستان کے لئے الگ معنی رکھتی ہے اور پاکستان کے لئے الگ، کشمیری مسلمانوں کے لئے یہ سچائی کچھ اور ہے اور کشمیر پنڈتوں کے لئے کچھ اور پھر کشمیر کی سرحد کے ساتھ دوسرے صوبوں میں رہ رہے ڈوگروں اور لداخیوں کے لیے یہ سچائی کچھ اور ہی معنی رکھتی ہے۔ ایسے پس منظر میں کوئی بھی ادیب آفاقی نظریہ پیش نہیں کرسکتا۔ وہ محض اپنے سچ کا اظہار کرسکتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں اس کو اپنے ہی مسلک کی مخالف کرنے سے باز رکھتی ہیں شاید اسی ادھورے سچ کو معروف صحافی غلام نبی خیالؔ نے تعصب کا لیبل لگا دیا ہے۔

''گزشتہ دو تین دہائیوں میں اہل کشمیر کو جن خوف ناک اور خون آشام حالات سے گزرنا پڑا، ان پر اگر چہ وقتاً فوقتاً مقامی افسانہ نگاروں نے خامہ فرسائی بھی کی لیکن ان تخلیقات میں زیادہ تر ذاتی تعصب اور سیاسی نظریات ہی کو ملحوظ نظر رکھ کر ایسا ادب تخلیق کیا گیا جو آفاقیت اور ابدیت کا دعویدار نہیں ہوسکتا۔'' (غلام نبی خیالؔ پیش نامہ، افسانوں کا مجموعہ 'علان جاری ہے' غلام بنی شاہد ۲۰۱۳ء، ص ۱۹)

یہی وجہ ہے کہ میں غلام نبی شاہد کی نگارشات میں کتابی آفاقیت اور عالمیت کا متلاشی نہیں ہوں بلکہ انسان کے تئیں ان کی ہمدردی، معصوم لوگوں کیلئے فکر مندی اور فنی

لوازمات کے برتنے کا ہنر ڈھونڈتا ہوں۔اور مجھے لگتا ہے کہ وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ان کا افسانہ' آجادی' ایک شاہ کار ہے جبس زدہ ماحول میں اس کے افسانوں میں بچے کھلونے نہ پا کر سپاہی کی بندوق کی فرمائش کرتے ہیں،صبح شام کانوں میں گونجتے ہوئے'' آزادی،آزادی'' کے نعروں سے متاثر ہو کر ایک ناسمجھ بچہ بھی ' آجادی' کی مانگ کرتا ہے اور پھر یار دوستوں کو پتھر بازی کرتے دیکھ کر ایک کمسن بچہ والدین کی چوکسی کے باوجود چوری چھپے ان کے ساتھ جاملتا ہے۔ یہ سب افسانہ نگار کے عمیق مشاہدے اور نفسیاتی تجزیے کا ثبوت ہے۔افسانہ نگار جب کسی غمگین ماں سے ملتا ہے اس کا سوالیہ چہرہ اُسے پوچھتا ہے کہ'' میرا بیٹا کہاں ہے؟''جب وہ کسی بچے کے پیلے مر جھائے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتا ہے بچہ استفسار کرتا ہے کہ'' یہ گولیاں کہاسے آرہی ہے؟''، کسی بوڑھے کی لاٹھی تھامنے کے لئے جب وہ آگے بڑھتا ہے تو بوڑھا سوال کرتا ہے کہ'' یہ ہڑتال...... یہ کرفیو......کب ختم ہوگا؟''اور تب وہ جال میں پھنسی مچھلی کی طرح تڑپتا ہے اور افسانے رقم کرنے لگتا ہے۔کیونکہ وہ حساس ہے، جذباتی ہے اور سچا کھرا انسان ہے۔غلام نبی شاہد کی شخصیت کے بارے میں نور شاہ کے تاثرات کا اقتباس پیش خدمت ہے:

''ان کی شخصیت میں سادگی اور بھولا پن ہے اور ان کے افسانوں میں سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ان کی کہانیوں کی خاموشیوں سے جو آواز سنائی دیتی ہے وہ دلوں کو چھوتی ہے، ذہن کو جھنجھوڑتی ہے اور بار بار اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ کچھ ہو گیا ہے، کچھ ہو رہا ہے اور کچھ ہونے ولا ہے۔کیا ہوا ہے، کیا ہو رہا ہے، یہ سب کچھ' اعلان جاری ہے' میں پوشیدہ ہے!!!''

(نورشاہ، حرف آغاز، افسانوں کا مجموعہ، 'اعلان جاری ہے' غلام نبی شاہد، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰)

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ غلام نبی شاہد کے سبھی افسانے کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ بھی اس دور کے کشمیر سے جب وہاں ابدانتظامی، بدعملی اور بدحالی کا دور دورہ ہے۔ انھوں نے واقعات کو اپنے ذہن کے کیمرے میں بند کر کے پھر قرطاس پر اتارا ہے۔ ان افسانوں میں گولیوں، بم دھماکوں، چھاپہ ماریوں، تلاشیوں، شناختی پریڈوں، پولیس حراستوں، حراستی ہلاکتوں اور غائب نوجوانوں کی روداد قلم بند کی گئی ہے۔ کہیں کہیں استعاروں اور علامتوں جیسے کتوں، ابابیلوں وغیرہ کے ذریعے بھی اپنا مدعا پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان افسانوں کے کردار جنت ارضی کے باشندے ہیں جن کے چہروں پر خوف، تردد محرومیت اور بے ثباتی کے آثار نمایاں ہیں اور جن کی ہر سانس دعا کرتی ہے کہ "کہ یا اللہ اب اس رات کی سحر کر دے۔" اکثر کردار بچے اور عورتیں ہیں کیونکہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ کس گناہ کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ اس بارے میں رفیق راز رقم طراز ہیں:

"کشمیر پچھلے بیس سال سے جن خون آشام حالات سے گزر رہا ہے شاہد نے زیادہ تر انھیں حالات سے اپنے افسانوں کے لئے موضوعات اخذ کئے ہیں۔ شاہد کے افسانے تجریدی یا علامتی نوعیت کے نہیں البتہ وہ اپنے کرداروں کی مختلف نفسیاتی کیفیات فنی خوبصورتی کے ساتھ ابھارتے ہیں۔" (رفیق راز، باطن کی آنکھ سے ظاہر کا مشاہدہ کرنے والا شاہد، افسانوں کا مجموعہ 'اعلان جاری ہے غلام نبی شاہد ۲۰۱۳ء، ص ۲۲') افسانوں کے مجموعے 'اعلان جاری ہے' میں بائیس افسانے شامل ہیں جن میں سے چھ افسانچے یا منی

کہانی کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔سب سے پہلے ان دو افسانوں کا ذکر کرتا ہوں جو اس مجموعے سے پہلے 'مٹی کے دیئے میں چھپے تھے۔ان میں سے ایک افسانہ 'بوند بوند پیاسی' ہے جو ایک لڑکی کے اندھے پیار کی رومانی کہانی ہے۔اس کہانی میں معشوقہ اپنے زیور بیچ کر اپنے محبوب کو پہلا ناول شائع کروانے کے لئے سرمایہ فراہم کرتی ہے مگر بدلے میں اسے رسوائی ملتی ہے اور وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر موت کی آغوش میں سما جاتی ہے۔افسانہ 'خواب ہ گھونگھٹ' میں راوی دہلی میں ایک خوبصورت بھکارن کو دیکھ کر اسے اپنے ساتھ مل کر راوی کو لوٹ لیتی ہے اور پھر اپنی ایک الگ جونپڑی احاطے کے باہر بنا لیتی ہے۔ان افسانوں کو اگر دوسرے افسانوں سے موازنہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاہد کے تخلیق شعور نے ایک جست میں نئے افق تلاشے ہیں۔

'اعلان جاری ہے' کا پہلا افسانہ مداوا الدین کے کرب کا آئینہ دار ہے۔ بم دھماکے میں ہلاک ہوئے اپنے بیٹے کی پوری لاش انھیں دفنانے کے لئے نہیں ملتی مگر ماں کی ممتا امید کا دامن پکڑ کر رکھتی ہے اور آخر کار خواب کی وساطت سے اس کا کھویا ہوا بازو ڈھونڈ نکالتی ہے۔ایسے ہی ایک خواب کا ذکر افسانہ نگار نے خود اپنی زندگی سے بھی وابستہ کیا ہے جو خوابوں پر اس کے تیقن کا غماز ہے۔'پناہ میں کریک ڈاون کے دوران دو بچے آصف اور زینب پولیس کی نظروں سے بچنے کے لئے اپنے باپ کی قبر کے پاس پناہ لیتے ہیں۔'آجادی' حاصل مجموعہ ہے۔اس کہانی میں جونہی بلکتے ہوئے کمسن بچّے کی بھوک مٹتی ہے تو شفیق فوجی اس کو مزید خوش کرنے کے لئے پوچھتا ہے کہ تمھیں اور کیا چاہیے۔جواب میں وہ بچّہ اپنی توتلی زبان میں کہتا ہے 'آجادی'۔اس لفظ میں پوری کشمیری قوم کی بازگشت سنائی دیتی ہے

کہ ایک بچہ بھی آزادی کا خواستگار ہے۔اس کہانی کی تخصیص اس کا نفسیاتی پس منظر ہے جو قابل تعریف ہے۔مذکورہ فوجی کو شفقت کا باعث ڈیوٹی نہیں بلکہ اس کی اپنی چھوٹی سی بچی کی یاد ہے جسے وہ بہت عرصہ سے نہیں مل پایا ہے۔یہاں انسانی فطرت کی عکاسی بڑی ہنرمندی سے کی گئی ہے۔وہ اس بلکتے ہوئے بچے میں اپنی بچی کی شبیہ دیکھتا ہے۔افسانہ 'درد کا دریا' ان لوگوں کے لئے یاددہانی ہے جو اس بات پر یقین نہیں کرتے کہ کشمیری لوگ مصائب کا سامنا کر رہے ہیں۔افسانے میں دلی کا ایک آدمی اپنے کشمیری دوست سے ملنے آجاتا ہے کیونکہ اس نے سنا ہوتا ہے کہ کشمیر میں حالات سدھر گئے ہیں۔مگر یہاں اس کے گھر کی تباہی اور پھر دوست کی موت دیکھ کر آزردہ ہو جاتا ہے۔حالات سدھرنے کو حوالے سے ہی ایک اور افسانہ 'جہلم اور فرأت کے درمیان' لکھا گیا ہے جس میں ایک آدمی باقی لوگوں کو اپنے رشتے دار قبرستان تک پہنچاتے دیکھتا ہے۔وہ اپنا ذہنی توازن کھو دیتا ہے کیونکہ اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کے دونوں بیٹے کہاں غائب ہو چکے ہیں۔'زندہ دارانِ شب' میں حکمران، ان کے پٹھو اور سیکورٹی فورسز کا مثلث دکھایا گیا ہے جو ایک دوسرے کو برسراقتدار رکھنے میں مددگار ہوتے ہیں جبکہ غریب عوام پسی جارہی ہے۔'گلی بلا رہی ہے' میں جونہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایریا میں فوجی چوکیاں (بنکر) اٹھائے جارہے ہیں تو وہ خوشیوں سے جھوم اٹھتے ہیں۔ایک اور کہانی 'سانحہ' میں حکومت مسلسل اعلان کرتی ہے کہ اب حالات نارمل ہو چکے ہیں جب کہ ایک چوک پر مظاہرہ ہوتا ہے، لاٹھی چارج اور گولیاں چلتی ہے لیکن پھر بھی حکومت کہتی ہے کہ یہ کچھ کتوں نے ہڑبونگ مچادی تھی۔افسانہ 'کرب زار' میں دس سال پہلے کریک ڈاؤن کے دوران نوری کا بیٹا اقبال ظہور کے ساتھ شناختی پریڈ میں چلے جاتے

ہیں۔ سیکورٹی فورسز اقبال کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں جبکہ ظہور واپس آجاتا ہے اور نوری کا دل رکھنے کے لئے وہ جھوٹ بولتا ہے کہ ابھی پریڈ جاری ہے اقبال ابھی آتا ہی ہوگا لیکن اس غم میں نوری ذہنی مریض بن جاتی ہے۔ اب جبکہ دس سال گزرنے کے بعد بھی اس کا بیٹا واپس نہیں آتا ہے خود ظہور کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ اپنے دوست سے پوچھتا ہے ''یار، یہ پریڈ کب ختم ہوگی۔۔۔؟'' اس طنزیہ فقرے میں گذشتہ پچیس برس کی تاریخ چھپی ہے۔ 'خدا کے ایک شہر میں' میں عزی کے سبھی قریبی رشتے دار ایک ایک کے کے مرجاتے ہیں اور آخر میں عزی بھی بم دھماکے سے فوت ہوجاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے ملنے والی راحت لینے کے لئے اب گھر میں کوئی بھی بچا نہیں ہے۔ 'یہ شام کیوں نہیں ڈھلتی' خوف و دہشت میں زندگی بسر کرنے والوں کی کہانی ہے جنہیں رات گزارنا بھی بھاری لگتا ہے۔ افسانے میں مشتاق اور عنبرین کو دروازے پر دستک سنتے ہی وہ دستک یاد آجاتی ہے جس میں ان کی زندگی الٹ پلٹ ہوچکی تھی۔ پہلے اگر کسی چیز کا خطرناک تجربہ ہوا ہو تو آدمی ہر دستک کو موت کی دستک سمجھ لیتا ہے۔ کہانی 'ہم جیت گئے' میں ڈیوٹی پر تعنیات فوجی ایک پارک میں کھیلتے ہوئے بچوں کی گیند بار بار اس لیے روکتا ہے تاکہ وہ ان پر اپنا رعب بٹھا سکے جبکہ چھوٹے بچے یہ چاہتے ہیں کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ بہت دیر کے بعد جب وہ ہٹ جاتا ہے تو بچے خوشی سے چلاتے ہیں کہ 'ہم جیت گئے'۔ منہ سے نکلا یہ فقرہ اس بات کی علامت ہے کہ بچے بھی چاہتے ہیں کہ وہ فوج پر فتح پائیں۔ ایک اور کہانی میں لوگ ایسی ہی خوشی کا اظہار تب کرتے ہیں جب فوجی ان کے اریا سے اپنی چوکیاں ہٹا لیتے ہیں۔ افسانہ 'ابابیلیں' میں لطیف اور حلیمہ اپنے بیٹے آصف کو باہر ہورہی سنگ بازی سے جس میں بہت سارے

بچے حصہ لے رہے تھے، باز رکھنے کے لئے گھر میں قید کرتے ہیں مگر وہ بیماری کا بہانہ بنا کر آخر کار بھاگنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جب وہ لوٹتا ہے تو باپ بہت غصہ کرتا ہے مگر وہ معصومیت سے باپ کو وہ چھوٹی سی کنکری دکھاتا ہے جو اس کی جیب میں ہوتی ہے اور پوچھتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ جونہی میں نے یہ چھوٹا سا پتھر اٹھایا تو پوری فوج میری جانب دوڑتی چلی آئی حالانکہ مجھے ان پر پتھر مارنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے خواب میں ابابیلیں، جو امن و سرخروئی کی علامت ہیں، آتی ہوئی دیکھی ہیں۔ 'خواب، قید اور تماشائی' ایک تجریدی افسانہ ہے جس میں آدمی کھیل دیکھنے کی غرض سے اندر تو چلا جاتا ہے مگر اُسے باہر آنے کا راستہ نہیں ملتا یہاں تک کہ وہ کہتا ہے '' کہ آج برسوں سے میں انہی بھول بھلیوں میں پھنسا باہر جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں...... جو مجھے ابھی تک نہیں ملا''۔ مہابھارت میں ایک ایسی ہی اساطیری کہانی ہے جس میں ابھمنیو کو چکرویوہ کے اندر جانے کا راستہ معلوم ہوتا ہے مگر اندر گھس کر وہ باہر نہیں نکل پاتا۔ موجودہ حالات میں اس کہانی کا اطلاق کئی واقعات سے ہو سکتا ہے جیسے کہ امریکا افغانستان اور وسط ایشیا میں گھس تو گیا مگر اب وہاں سے باہر نہیں نکل پاتا، کشمیر میں فوج تو بھیجی گئی لیکن اب انھیں واپس بلانا حکومت کے لئے مشکل ہو رہا ہے یا پھر کشمیریوں نے آزادی پانے کے لئے ہاتھ میں بندوق تو اٹھائی مگر اب واپس امن ابحال کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی ہے۔

اس کے علاوہ مجموعے میں چھ افسانچے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے۔ ۱) 'جواب دو' اس افسانچے میں ظرافت اور طنز سے کام لیا گیا ہے۔ پس منظر میں ایک بڑی سی ہورڈنگ دکھائی گئی ہے جس پر فردوسی کا وہ شعر لکھا ہوا ہے کہ دنیا میں کشمیر ہی ایک ایسی جگہ

ہے جو فردوس کہلانے کے لائق ہے۔لیکن اس کے عین نیچے ایک ماں کے ہاتھ میں پلے کارڈ ہے جس میں وہ پوچھتی ہے کہ 'میرا فردوس کہاں ہے؟' فردوس اس کا بیٹا بھی ہوسکتا ہے یا پھر اس میں جنت بے نظیر کشمیر کی گمشدگی کا اعلان ہوسکتا ہے۔'۲) 'بازیافت' افسانچے میں بیٹے کے انتظار میں والد کو بیٹا تو نہیں مگر اس کی قبر کا پتہ چلتا ہے۔۳) 'وہ کون ہے' افسانچے میں یہ باور کرایا گیا ہے کہ سیاحوں کو بھی ہر جگہ فوجیوں کا ہونا کھلتا ہے۔ سیر و تفریح کے بعد ایک کنبے کا بچہ فوجی کی طرح اشارہ کرکے اپنے دادا جی سے پوچھتا ہیں کہ ''وہ کون ہے؟'' ۴) 'احتیاط': طنزیہ افسانہ جس میں ایک فنکشن پر دو فٹ بال ٹیموں کے بیچ میچ ہونا طے ہے اور امن کی خاطر احتیاطاً ایسے لوگوں کو حراست میں لینے کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ جن پر افراتفری پھیلانے کا شک ہو۔ خصوصی مہمان یعنی منسٹر وقت پر پہنچ جاتا ہے مگر ٹیمیں حاضر نہیں ہوتی۔ پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کے سارے ممبر حراست میں لئے جاچکے ہیں۔۵) 'تھکن' منتظر ان والدین کو کوئی یہ بتاتا ہے کہ ان کا ایک رشتہ دار راجستھان سے واپس آیا ہے اور اس نے ان کے بیٹے کو وہاں ایک جیل میں دیکھا ہے مگر شومئی قسمت کاغذ پر جو ایڈریس دیا گیا ہے وہ پڑھا نہیں جاتا۔۶) 'کاٹ' ایذا پسندی کی کہانی ہے جس میں ایک باؤلی کتیا سے ہر کوئی ڈرتا ہے مگر دل میں یہ تمنا کرتا ہے کہ وہ کتیا اسے کاٹے کیونکہ اس کاٹ میں لذت ہے۔

غلام نبی شاہد کے افسانوں کے بارے میں محمد یوسف ٹینگ فرماتے ہیں: ''ان کے زیر نظر افسانوں میں سے ہر ایک شاہکار تو نہیں ہے لیکن بعض افسانے پڑھ کر یقیناً کشمیر کے درد لا دوا کے بارے میں نایاب آگہی کے شعلے منظر کو خوفناک حد تک روشن کرتے ہیں۔ اس میں عزیز رشتہ داروں، دوستوں اور واقف کاروں کی ہلاکت اور ان کے غائب ہوجانے

کے جو تجربے بیان ہوئے ہیں، ان میں اندر کی ٹیس، دردِ جگر اور حیرت زا ماتم تو ہے لیکن رقت اور آنسو ے بہانے کے انداز ٹالے گئے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ کشمیر کے اس لالہ گوں دور کو ہماری اگلی نسلیں ایسے ہی ادب کی عینک سے دیکھا اور محسوس کر پائیں گی۔'' (محمد یوسف ٹینگ پیش کلام، افسانوں کا مجموعہ'اعلان جاری ہے'غلام نبی شاہد ۲۰۱۳ء ص ۳)

جہاں تک غلام نبی شاہد کے تخلیقی سفر کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ وہ اس سفر میں سرخ رو ہو چکے ہیں البتہ انھوں نے اپنے کینواس کو محدود کر لیا ہے اور یہ عالمی شناخت بنانے میں آڑے آ سکتی ہے اور بھی غم ہیں زمانے میں حراست کے سوا کے مصداق انھیں زندگی کے مختلف شعبوں پر بھی قلم اٹھانا چاہیے اور نہ صرف موضوعات بلکہ کرداروں میں بھی افقی اور عمودی تنوع لانے کی کوشش کونی چاہیے۔ آخر میں اس حوالے سے کشمیر کے ہی ایک معروف ادیب عمر مجید کے خیالات کا اقتباس موصوف کے مجموعے'عمر مجید کے بہترین افسانے' سے یہاں پر نقل کرتا ہوں:

'' آج اردو میں سینکڑوں کی تعداد میں افسانے لکھے جا رہے ہیں اور پڑھے بھی جا رہے ہیں لیکن ان افسانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو اپنا نقش تادیر قائم رکھ پاتے ہیں...... اگر واقعی کہانی کی واپسی ہوئی ہے تو وہ کہانی کہاں ہے؟ اور وہ اپنا وجود منوانے میں آخر کامیاب کیوں نہیں ہو پاتی؟ مطلب یہ کہ نہ پلاٹ، نہ کردار، بس واقعات ہی واقعات آج کے افسانوں کی شناخت ہیں۔ کیا افسانہ واقعات کی کھتونی محض ہے؟''

کشمیر اعظمیٰ ۲۶/۱ اکتوبر ۲۰۱۴ء

............☆☆☆............

میری نظر میں

(اعلان جاری ہے)

مبصر: محمد اقبال لون

ریاست جموں وکشمیر کے اُردو ادب میں غلام نبی شاہد ایک جانا پہچانا نام ہے۔ گزشتہ تیس برسوں سے اُردو افسانے کی زلفیں سنوار نے میں سرگرم عمل ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز ۱۹۷۳ء میں ''کتنے جھنڈے'' کے عنوان سے افسانہ تحریر کر کے کیا جو اس وقت موقر روزنامہ آفتاب میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں ''مٹی کے دیئے'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا جو اردو اور کشمیری ادیبوں کی مشترکہ کوشش تھی۔ اس مجموعے میں شاہد کے چار افسانے شامل ہیں۔ حال ہی میں غلام نبی شاہد کا پہلا باقاعدہ افسانوی مجموعہ ''اعلان جاری ہے'' کے نام سے شائع ہوا جس میں ۲۲ افسانے ہیں جو اکثر

ریاست اور بیرون ریاست کے رسائل وجرائد بالخصوص ''کشمیر عظمیٰ'' میں چھپ چکے ہیں شاہد صاحب کے جسم وجان میں کشمیریوں اور کشمیر کے حالات کا گہرا احساس اور ادراک ہے۔ پورا افسانوی مجموعہ اسی درد وکرب سے لبریز ہے۔ کشمیر میں مزاحمتی ادب کے حوالے سے یہ اپنی نوعیت کی اہم کوشش ہے۔ کتاب کے ابتدا میں ریاست کے معروف افسانہ نگار نورشاہ کے حرفِ آغاز، ریاست کے قدآور ادیب اور محقق محمد یوسف ٹینگ کے پیشِ کلام، وادیٔ کشمیر کے سرکردہ صحافی اور ادیب غلام نبی خیال کا پیش نامہ جیسے عنوانات کے تحت شاہد صاحب کی افسانہ نگاری اور موضوعات کے حوالے سے کئی اہم نکتے اُبھارے گئے ہیں اور ان کے طرزِ تحریر اور فنی خوبیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ریاست کے اہم اردو شاعر رفیق رازؔ کے تاثراتی تحریر بھی شاملِ کتاب ہے۔ غلام نبی شاہد نے عرضِ حال عنوان کے تحت اپنے افسانوی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کے پس پردہ اسباب ومحرکات کا بھی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

چونکہ افسانہ ہماری زندگی کا عکس ہے جو کسی خاص پہلو یا واقعہ کی جانب نشاندہی کرتا ہے۔ غزل کی طرح ایجاز واختصار بھی اس کا جزولاینفک ہے اس کے ساتھ وحدت تاثر اس کی روح ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''اعلان جاری ہے'' میں غلام نبی شاہدؔ نے کشمیر کے پُرآشوب دور اور کشمیریوں کے درد وکرب کی موضوع بنایا ہے اور اپنے مشاہدات، تجربات، خیالات اور احساسات کو نہایت ہی فنکارانہ پیرائیہ میں صفحۂ قرطاس کے سپرد کیا ہے۔ وادیٔ کشمیر جن خوں آشام حالات واقعات سے دوچار ہے۔ خاص کر گزشتہ دودہائیوں سے کشمیر میں ہو رہے ظلم

وبربریت، لوٹ مار، قتل وغارت، افراتفری، جنگ وجدل، بے چینی و بے سکونی، انتشار، کرفیو اور غیر یقینی صورتِ حال کو موضوع سخن بنایا ہے۔ان کے افسانوں کا کینوس ان ہی حالت پر محیط ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں صرف سچ اور حقیقت نگاری کو جگہ دی ہے بلکہ اگر یوں کہئے ان کے افسانے وادیٔ کشمیر کے حالات وواقعات خصوصاً گزشتہ دو دہائیوں کے عکاس وترجمان ہیں تو شاید مبالغہ نہیں ہوگا۔اس حوالے سے ان کے افسانوں میں آجادی، درد کا دریا، بازیافت، احتیاط بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں۔اس طرح کے حالات وواقعات میں انسانی صداقت اور بے باک ردعمل، دردمندی اور صاف گوئی کا خواہاں ہے۔اپنی ذات اور زبان پر شاہدؔ صاحب کا اعتماد اسے آج کے دور کا ایک منفرد افسانہ نگار تصور کر لینے کی حمایت کرتا ہے اور ان کی تخلیقات قارئین کو برانگیختہ اور اُکسانے پر مجبور کرتی ہیں۔ان کے افسانوں کے حوالے سے ریاست کے معروف افسانہ نگار نور شاہ یوں رقمطراز ہیں۔

ان کے افسانوں میں سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے ان کی کہانیوں کی خاموشیوں سے جو آواز سنائی دیتی ہے وہ دلوں کو چھوتی ہے ذہن کو جھنجھوڑتی ہے اور بار بار اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ کچھ ہوگیا ہے کچھ ہو رہا ہے اور کچھ ہونے والا ہے''۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ ۲۲ کہانیوں پر مشتمل ہے جن میں مداوا، پناہ، آجادی، جواب دو، درد کا دریا، بازیافت، جہلم وفرات کے درمیان، گلی بلا رہی ہے، سانحہ، کرب زار، وہ کون ہے، خدا کے ایک شہر میں، یہ شام کیوں نہیں ڈھلتی، ہم جیت گئے، احتیاط وغیرہ قابلِ ذکر افسانے ہیں۔جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ان تمام افسانوں کا مرکز ومحور وادیٔ کشمیر

کے ناگفتہ حالات ہیں۔ جنھوں نے یہاں کے ہر فرد کو متزلزل کر دیا ہے۔ بقول نور شاہ قریب قریب یہ ساری کہانیاں کشمیر کے پُر آشوب، پر درد اور کرب آمیز دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس مجموعے میں شاہد صاحب کا ''آجادی'' ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے۔ جو نہ صرف فنی اور تکنیکی اعتبار سے مکمل ہے بلکہ جس فنی چابک دستی سے اس افسانے میں کشمیریوں کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

بقول ٹینگ صاحب کیا کشمیریوں کے جذبۂ دل کی اس معصوم تفسیر سے زیادہ اور بہتر ترجمانی کی جا سکتی ہے؟۔ یقیناً اسی تمنا کے لئے کشمیری عوام کئی دہائیوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پس رہے ہیں اور نت نئے مظالم برداشت کر رہے ہیں۔ اس لئے اس سے بہتر کشمیریوں کے جذبوں، ارمانوں، آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر و تشریح ممکن نہیں۔ میرے خیال میں شاہد صاحب کا یہ افسانہ کشمیری قوم کی حالتِ زار کا آئینہ دار ہے۔

''اعلان جاری ہے'' کے مطالعہ کے بعد یہ اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شاہد صاحب کی زبان اور اظہار بیان اپنی فکر کی رو میں ایسا بیانیہ اظہار خلق کرتا ہے جو اپنی ندرت، جدت اور انفرادیت کے لحاظ سے اطمینان بخش ہے۔ وہ اپنے گرد و نواح کے ماحول سے اندیشہ دور دراز کا احتساب کرتے ہیں اور اسے اپنے تخلیقی اظہار کے قالب میں ڈھالنے کے لئے جس لفظیات، تراکیب، محاروں اور استعاروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ اُس کے ماحول، مزاج اور فکری حسیت کے آئینہ دار ہے۔ وہ بے ساختہ اور نہایت ہی سیدھے انداز میں اپنے کہانیوں کو منطقی انجام تک پہنچاتے ہیں اور کہانی کے اختتام پر جس انداز سے وقت کے جابروں پر کارِ ضرب مارتے ہیں وہ اُن کا شیوہ ہے۔ ریاست کے بزرگ ادیب اور محقق محمد

یوسف ٹینگ ان کے طرزِ تحریر کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''شاہد نے اپنے بیانیئے کو غیر ضروری تکرار اور تواتر سے بوجھل نہیں بنایا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز سے باتیں کرتے ہوئے آگے قدم بڑھایا اور کم سے کم عبارت میں مفہوم ادا کرنے کی سعی کی ہے یہ جدید اردو کے بڑے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔''

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر افسانے کہانیت سے بھرپور ہیں اور کشمیر میں اردو افسانے کے حوالے سے ایک خوش آئندہ قدم ہے بقول ٹینگ صاحب ''مجھے اس کتاب میں اردو کی سطح پر ایک تسکین ملی۔ چند خامیوں کے باوجود زبان و بیان پر کما حقہ دسترس، الفاظ کی بندش، جملوں کی سجاوٹ اور محاروں کا بھرپور استعمال ذہن و دل کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کے روشن مستقبل کی ضمانت دیتے ہیں! بقول غلام نبی خیال...... ''جس کی وساطت سے شاہد نے کشمیر کی افسانوی ادبیات میں وقت سے پہلے ہی اپنا ایک مقام حاصل کیا ہے۔'' بہرحال مصنف نے زباں صاف ستھری استعمال کی ہے اور اس کی محنت قابلِ ستائش ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوگی۔

اُردو اکادمی اگست تا دسمبر ۲۰۱۳ء

............☆☆☆............

O

From Agha Shahid to Ghulam Nabi Shahid Reviewing Ghulam Nabi Shahid's "Ailan Jaari hey"

ABID AHMAD

Frank O'Connor, who wrote the path-breaking book, The Lonely Voice, on the art of the short story, holds that the form has a special fascination with submerged population groups. O'Connor asserts that the genre is one that has never had a hero and, therefore, lends itself to stories of outsiders and societies' marginalia. The genre is believed to be especially suited to the issues and concerns of the troubled or lesser-represented identities. That is why it has been referred to as a 'minor literature'.

Kashmir has very old connection with the art of the story-telling. It is said about the Panchtantra that Gunadia, a writer in Pashachi language of Kashmir, presented a book of stories divided into eight parts and titled as "Brahat Katha" to his king Satwahan. However, the king refused to listen to these stories as the language used was not that of the king. The refusal hurt the writer so much that he consigned all the stories to fire. One part somehow survived

and was translated into Sanskrit by Som Dev as "Katha Sarit Saghar" which is one of the oldest books of stories. The Panchatantra has inspired much of the later story writing tradition across cultures.

The short story, in its modern form, superseded other genres of the Kashmiri literature in the artistic projection of the unique Kashmiri lifestyle and its cultural vision. It has richly portrayed the Kashmiri society with all its social, religious and cultural diversity. Though the genre emerged on the landscape of the Kashmiri literature as late as the late 40's and early 50's of the twentieth century, but it soon successfully established itself in the realm of the Kashmiri literature. In the beginning, it served as a tool of propaganda in the hands of Progressive writers, but it soon moved towards a serious art form, shorn of its propagandistic element. Over the years, Kashmiri language has produced great prose literature through its short stories with some stories comparable to masterpieces at global level.

"Ailan Jari Hey" by Ghulam Nabi Shahid is a refreshing addition to the same rich tradition, albeit in Urdu language. It is the first collection by Shahid, carrying 22 short stories. There are no full-fledged characters but silhouettes having assumed powerful symbolic value in the context of the contemporary Kashmir. Thematically, the author does not filter the truth. He limns it as it is. Each story is actually an attempt to seize certain historical moments from the immediate history of Kashmir and turn them into a sort of writing that is pain for ever.

Memories are the hardest part of life to deal with. They transcend the categories of time and, while historically existing in the past, shape the present as well as the future. Writing is one of the ways to purgate memory of its intensity. Shahid's stories bear this truth out that cultures and memories reveal their traumas in and through literature. Shahid's stories are cliffs of the grief and narratives of the collective pain of Kashmir.

In "Ajadi", a non-local cop, Surinder, while patrolling the streets of a curfewed city, decided to provide chips packet to cheer up a crying kid. Once he hands the packet to the kid, he asks him if he needed anything else, the kid instantly blurts out 'Ajadi'. Muhammad Yusuf Taing, in his Introduction to the book, rightly says that "there could not a better articulation of Kashmiris' collective aspirations than this innocent expression."

"Who Koun hai" is a beautiful punch on the intruding presence of soldiers in every nook and corner of Kashmir. Raju is on a vocational tour to Kashmir along with his family. He is confounded by 'that one' whom he comes across everywhere they go. Ultimately, he asks his grandfather who in turn informs him that "beta, who fouji hey" (Son, he is a soldier.) The story of a routine sight in Kashmir being a bothering aberration for a non-local child is a serious comment on militarization of civilian areas in Kashmir.

There are stories on enforced disappearances and their debilitating effects on the family members of the disappeared. "Bazyaft" is a story, showing how a tragedy assumes the shape of a glad-tidings for Ahad Lone whose house is seen abuzz with activities after decades. On being asked by his neighbours if there was any news about his disappeared son, Aslam, he calmly replies, "Yes, his grave has been located."

There are some stories commenting on darker social issues too. "Bond bond Pyasa" is a story whose protagonist goes into shock once he comes to know that the begging kid outside his office whom he would always look with disdain and hatred is actually his own illegitimate child, whom he had disowned long back.

Most of the stories remind the reader of O' Henry, whose stories are known for their surprise endings which force the reader to reread the whole story in the light of the unexpected ending. What distinguishes Shahid from other contemporary writers of Kashmir is his uncompromising commitment to the portrayal of truth. The

stories are commendable for their forthright impression, clear narrative, forceful impact and memorable characters. They dexterously reflect the predicament the Kashmiris are caught in.

Shahid's stories can easily claim to be beautifully expressing the collective aspirations and anxieties of the Kashmiris. The stories belong to that bold genre of literature globally known as 'resistance literature'. If Agha Shahid Ali gave expression to the agony of Kashmír in verse, Ghulam Nabi Shahid has opted for the short story to do the job.

Greater Kashmir, July 3rd 2014

O

INKING CATHARSIS

Bilal Handoo

Ghulam Nabi Shahid might not be a giant in the literary circles of Kashmir, but with his recent anthology 'Allan Jari Hai', the writer has weaved the narrative reflecting the ground scenario of valley from the common man's perspective. Bilal Handoo profiles the writer and his work.

Occasional cries (of a child) are breaking the stillness of streets near Srinagar's Dareesh Kadal. Another summer day is reeling under curfew. It is 2010 and state authorities have imposed siege to 'restore' law and order. But as clampdown continues, scores of households around the city are running out of food grains. By crying his heart out, a child is, perhaps, hinting the same miserable concern prevailing in his home.

Which intriguies a non-local inspect, namely Surindra, standing guard near the bridge, moving closer to the source of crying he finally zeroes on a house boat near the bank of the river. Upon enquiring from the family, Surindra comes to know: there are no food grains available in child's home. Touched by the condition of

crying child, the inspector takes his father out along with him for buying food grains. The officer orders a local grocer to open his shop for a while and lent out some food grains to the child's father.

But the child is still inconsolable. To calm him down, Surindra buys him a packet of chips. He stops crying, which makes the inspector happy. And then, he asks the child, quite earnestly: "What else you want?"

While playing with chips packet, the child briskly, replies: "Ajaadi!" (Freedom)

The above is the summary of Ghulam Nabi Shahid's acclaimed Urdu short story 'Ajaadi'. It is one among the twenty two short stories of an anthology titled "Ailaan Jari Hai" (announcement continues) penned down by Shahid over the span of last ten years.

'Ajaadi' has been included in the list of best 13 Urdu proses from Kashmir in an anthology "Kashmir ke taira Urdu Afsaane" (Kashmir's 13 best Urdu proses). Shahid's prose has figured alongside the works of literary giants of the valley, like Prem Nath Pardesi's Dool, Akhtar Mohiuddin's Pondrech, Pushkar Nath's Dard ka maara and others.

Presently living away from the crowd in the hushed neighbourhood of Srinagar's Parray Pora, Shahid's literary journey began from Old City, his birthplace. During his school days, he would take a novel on rent for reading from one Janta Stationary outside his school, Hindu High School Sheetal Nath at Srinagar's Barbershah locality. The shop was run by one Maharaj, a Kashmiri pandit. But the book affair which simply started as a fun soon turned into a hobby and then into an obsession for him.

Apart from the creative display, writing is equally considered as catharsis for both reader as well as writer. A burdened psyche of a writer often finds solace in writing. It was a search for the same solace that drove Shahid into writing as an untimely death of his dear friend had traumatised his mind.

His childhood friend, Dilip Kumar, a Kashmiri pandit was killed in police action when riots broke out in Lal Chowk in mid 60s. "After his death, he came in my dream carrying a glass frame in his hands," says Shahid, a retired private official. "Inside the glass frame was a dry sapling. Dilip asked me, 'would you water this sapling?' I replied, 'Yes, I will.' "

When the same dream repeated itself on regular intervals, Shahid understood the underlying message. "By watering the sapling, he meant: I should carry forward the creative expression through writing," says Shahid, a widower whose wife was devoured by cancer last year. "As we were both growing up, we had developed a great flair for writing. And by showing up in my dream frequently, it meant that he wanted me to continue the same."

At present stage of life, Shahid has created his own niche in the storytelling. Unlike most in his tribe, his short stories portray the ground situation in Kashmir quite fearlessly. His narrative seems embedded with emotive appeals. And while weaving his tales, he doesn't seem to compromise on truth. The same is quite reflective from his prose 'Jawab Do' (Answer me), which reflects the plight of Khateeja, a mother of a disappeared son, Firdous:

It is 10th of a month and relatives of disappeared persons have gathered inside Srinagar's Pratap Park. Holding placards in their hands, the protesters are silently demanding the whereabouts of their disappeared sons. Among the aged mothers turning up for the silent sit-in, Khateeja, too, is silently holding a placard in her hand.

Just above her head, a hoarding overlooking the park, placed near B Ed College Srinagar, reads:

Agar Firdous Baroye Zameen ast

Hame ast o, hami ast o, hami ast

(If there is a paradise on earth

It's this, it's this, it's this)

Quite mindlessly, Khateeja lifts the placard in her hand in the foreground of hoarding, which reads: "Mera Firdous kaha hai?" (Where is my Firdous?).

Apart from writing in Urdu, Shahid is equally prolific and proficient in Kashmiri. Besides, he writes scripts and dramas for audio as well as visual medium.

Mohammad Yousuf Taing, a renowned literary figure of the valley, describes Shahid's anthology as "a work which exposes the pain of Kashmir in a terrific manner".

Literary figures apart, Shahid rates common Kashmiris as his true admirers. After reading his works, one man buzzed him from Kishtwar and congratulated him. On other occasion, a tailor from Hazratbal called him up and told him: "I could relate with one of your short stories wherein you have expressed the dilemma of a father who steps outside his home for the medical treatment of his daughter during a curfew. You know what? I faced the similar situation recently when I took out my ill daughter for treatment during a curfew. Thanks for writing this!"

But, perhaps, the biggest compliment he received so far came was from the relative of disappeared person who after reading his short story 'Jawab Do' rang him up: "First, the man broke down on phone," he says. "And then, he thanked me for presenting their plight before the larger public."

In Shahid's anthology, a short story 'Baazyaaft' (or, to locate) reflects the mysterious reaction of a father (Ahad Lone) upon knowing the destination of his disappeared son:

A crowd of people have started gathering near Lone's residence since afternoon prayers. It is the first time since many years that neighbours are witnessing buzzing activities outside Lone's house. Everyone seems clueless. As the time for evening prayers is approaching fast, almost everyone in the locality is busy speculating the reason behind the buzz.

When finally Ahad Lone steps out of the mosque along with others after offering the last prayers of the day, people notice a mysterious calm on his face which makes them to quiz him: "Ahad Lone, what is going on? Have you received any news about Aslam [his son]?"

"Yes," Lone replies rather in calm but in confident tone.

"Where was he? When is he coming? Has he already arrived?" His neighbours ask. Someone among the crowd asks rather in an emotional tone: "Is Aslam not coming?" Ahad Lone, very calmly, replies: No "His grave has been located!" All the stories in the anthology have been woven with the similar realistic narrative.

Shahid might not be the celebrated writer of our time, but he is happy with his "small" literary contribution. "I don't write for any literary honours and prizes," he says. "I only ink to invoke catharsis in my own people!"

Kashmir life July 12, 2014

Ailaan Jari Hai
Short Stories
By
Ghulam Nabi Shahid
یااللہ اب اس رات کی سحر کردے
نیا سورج ...... نئی روشنی دے
چشمے خون اُبل رہے ہیں میرے
قطرہ قطرہ رو رہے ہیں دریا میرے
میری صبحیں رو رہی ہیں
میری شامیں رو رہی ہیں
دن کا اُجالا رات سے سیاہ ہے
رات کا آنا قبر کا گماں ہے
اس اندھیرے میں سوجھتا کچھ نہیں
نئی صبح نئی شام دے
یااللہ اب اس رات کی سحر کردے